شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نور اللہ مرقدہ

مکتبہ ملت دیوبند

یو پی

۲۴۷۵۵۴

تفصیلات

نام کتاب ـــــ مواعظِ حسنہ

مُصنف ـــــ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

سنِ اشاعت ـــــ سنہ ۱۹۹۷ء م سنہ ۱۴۱۸ھ

باھتمام ـــــ قاری محمد طلحہ صدیقی

مطبوعہ ـــــ

:- ناشر :-

مکتبہ ملت دیوبند یو، پی

۲۴۷۵۵۴

عرضِ ناشر

کاندھلہ یا تھانہ بھون کے گلی کوچے ہی نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، حیدرآباد دکن کی درسگاہوں سے لے کر پاکستان کا ہر شہر ہر قریہ خصوصاً جامعہ عباسیہ بہاولپور جامعہ اشرفیہ لاہور، اور جامع مسجد نیلا گنبد لاہور کی اینٹ اینٹ اس بات کی گواہ ہو گی کہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ایک علومِ معارف کا خزانہ، متقدمین کے علوم کے حوالوں کا ذخیرہ، ایک مجسم کتب خانہ دلائل کی ایک ضخیم کتاب، حوالہ جات کی عظیم لائبریری، علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی زبان تھے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! آج ہم اس سعادت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں کہ حضرتؒ کے مواعظ حسنہ کا ذخیرہ یکجا صورت میں پیش کر رہے ہیں، امید ہے کہ حق تعالیٰ ان علوم کی نشر و اشاعت کو ہماری نجات اور صلاح و فلاح کا ذریعہ فرمائیں گے اور پڑھنے والوں کو علم نافع عطا کریں گے۔ آمین

انعام الٰہی قاسمی

فہرست

مختصر حالاتِ زندگی

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

از مشرف علی تھانوی

پیدائش ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ (۱۲ اگست ۱۸۹۹ء) کو شہر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے والد اس زمانہ میں ریاست بھوپال میں محکمہ جنگلات کے مہتمم تھے۔ اصل وطن کاندھلہ ضلع مظفر نگر یو پی بھارت ہے۔

ابتدائی تعلیم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون کے مدرسہ میں حضرت تھانوی کی خصوصی نگرانی میں مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہیؒ مصنف تیسیر المنطق سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔

مظاہر علوم ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے خود ہمراہ لیجا کر مدرسہ عربیہ مظاہر علوم میں متوسط کتب میں داخل کرایا۔ یہاں دورہ تک تعلیم مکمل کی اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا عبداللطیف صاحب، مولانا ثابت علی اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ سے فیض تلمذ کیا۔

دارالعلوم دیوبند مظاہر العلوم سے فراغت کے بعد علامہ انور شاہ کشمیری سے حصولِ علم کے ذوق میں دارالعلوم دیوبند آگئے اور دوبارہ حدیث پڑھی۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں فراغت ہوئی۔ یہاں علامہ انور شاہ صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا محمد احمد صاحب اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے فیض تلمذ حاصل کیا۔

مدرسی

سنہ ۱۹۱۹ء سے مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرسی کی ابتداء کی۔ مگر ایک سال بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں دارالعلوم کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مجبور کر کے مدرسہ امینیہ کی ملازمت چھڑوا کر دارالعلوم میں بلالیا۔ اس کے بعد سے سنہ ۱۹۲۹ء تک اور دوبارہ سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۹ء تک دارالعلوم میں شیخ التفسیر کے عہدہ پر فائز رہے۔ صرف درمیان میں چند سال حیدر آباد دکن قیام رہا۔

پاکستان آمد

سنہ ۱۹۴۹ء میں ریاست بہاولپور کے وزیر تعلیم کی خصوصی دعوت پر بہاولپور پہنچے اور شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ عباسیہ میں پڑھایا۔

لاہور کا قیام

سنہ ۱۹۵۲ء میں محمد حسن صاحب امرتسری مرحوم بانی جامعہ اشرفیہ کے شدید اصرار پر بہاولپور سے لاہور تشریف لائے اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۴ء تک شیخ الحدیث والتفسیر کے منصب پر خدمات انجام دیں۔ نیز ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۴ء تک تقریباً لگاتار نیلا گنبد کی مسجد میں وعظ فرمایا۔

اولاد

حضرت مولانا کے چھ لڑکے اور دو لڑکیاں کُل آٹھ اولاد ہے۔ لڑکے الحمدللہ سب حافظ قاری اور پورے درس نظامی کے فاضل عالم ہیں۔

(۱) مولانا محمد نعمان صاحب (سب سے بڑے لڑکے) نیلا گنبد کی مسجد میں خطیب ہیں۔

(۲) مولانا محمد مالک صاحب والد مرحوم کی جگہ شیخ الحدیث کی حیثیت سے جامعہ اشرفیہ لاہور میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۳) مولانا محمد میاں صاحب وزارت امور مذہبیہ پاکستان میں بڑے عہدہ پر فائز ہیں۔

(۴) مولوی محمد عثمان صاحب دارالعلوم دینیہ انجمن حمایت اسلام میں قرأت پڑھاتے ہیں۔

(۵) مولوی محمد عمران صاحب، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نسبت روڈ لاہور میں شعبہ اسلامیات کے انچارج ہیں۔

(۶) مولوی محمد احمد صاحب: محکمہ واپڈا سے ملحقہ ایک محکمہ میں بحیثیت اسسٹنٹ فائنز ہیں۔

(۷) بڑی دختر زوجہ قاضی افتخار احمد بھنجانوی۔ مقیم حال کراچی۔

(۸) چھوٹی دختر زوجہ مشرف علی تھانوی ابن مفتی جمیل احمد تھانوی۔ راقم الحروف۔

روحانی مشرب

بیعت کا باضابطہ تعلق حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری سے تھا۔ مگر فیوض و برکات حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی حاصل کئے تھے۔

سیاسی نظریہ

تحریک پاکستان میں مولانا نے ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے اگرچہ شرکت نہیں کی مگر دو قومی نظریہ کی حمایت اور پاکستان کی تائید میں ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے مکمل قیادت فرمائی اور اپنی تقریروں اور درسوں میں کانگریس کے نظریہ کی ہمیشہ تردید کی۔

ممتاز شاگرد

مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد میاں دیوبندی، مولانا عبید اللہ انور، مولانا محمد سالم قاسمی دیوبند، مولانا سید اسعد مدنی۔ مولانا محمد مالک شیخ الحدیث

تصانیف

عربی، فارسی اور اردو میں ایک سو سے زائد کتابیں لکھیں جن میں بعض کتابیں بیس جلدوں میں ہیں۔ اردو تفسیر ۹ جلد۔ شرح بخاری عربی ۲۰ جلدیں۔ شرح بخاری اردو ۵ جلدیں۔ شرح مشکوٰۃ عربی ۸ جلدیں۔ شرح بیضاوی ۲۲ جلدیں۔ سیرت ۴ جلدیں۔ شرح الفیہ حدیث ۴ جلدیں۔ اسکے علاوہ تفسیر حدیث، عقائد، سیرت، تقابل ادیان وغیرہ پر بہت سی تصانیف ہیں

تعلیمی نظریات

تعلیمی نظریات میں حضرت انگریزی تعلیم کے خلاف تو نہیں تھے مگر اس کے طریق تعلیم میں تبدیلی کے خواہشمند تھے۔ ہاں مخلوط طریق تعلیم کو مسلمانوں کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ رسالہ "مسئلہ تعلیم" سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت نے تین قسم کے نصاب تجویز کر رکھے تھے۔ ایک مکمل درسِ نظامی، ایک اُن لوگوں کے لیے جو حدیث و تفسیر تک مختصر راستہ سے پہنچنا چاہیں اور ایک عام مسلمانوں کی بنیادی تعلیم کے لیے۔

وفات ۸ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء کو صبح پانچ بجکر دس منٹ پر رحلت فرمائی۔ نماز جنازہ جامعہ اشرفیہ میں مولانا محمد مالک کاندھلوی نے پڑھائی اور پچاس ہزار سے زائد سوگواروں کے لا الہ الا اللہ کے نعروں کے ساتھ اچھرہ کے قبرستان میں جو فیروز پور روڈ کے مشرقی جانب واقع ہے ہمیشہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۞

ناچیز نے مرثیہ کے آخر میں یہ شعر کہے ہیں انہیں پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

از برائے مغفرت گوید دل ہر مستفیض — رحمتِ حق بر مزارِ تو ببارد بے حساب

وائے عارف بود ہنگام سحر عالم خراب
رفت آں مہتاب دیں قبل طلوع آفتاب

۱۹۷۴ء

مُنتظر علی تقوی

❖

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نیت کی فضیلت اور اسکی حقیقت

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ

فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ

لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ امابعد

فقد روینا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال انما الاعمال

بالنیات وانما لامرئ مانوی۔ فمن کانت ھجرتہ الی اللہ و

رسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا

او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ۔ (بخاری ومسلم)

اس حدیث میں دو چیزوں کا ذکر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک "اعمال" کا۔ دوسرے "نیت" کا۔ پہلے میں نیت کے متعلق عرض کروں گا۔ اس کے بعد انشاء اللہ اعمال کے متعلق بیان ہو گا۔ قرآن مجید اور احادیث میں جا بجا ترغیبات موجود ہیں کہ اعمال کی قبولیت کا دارومدار ہی نیت پر ہے اور نیت کی فضیلتیں اور اُس کا ثواب بہت جگہ قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک جگہ خدا تعالےٰ نے فقرائے مسلمین کے بارے میں آیت نازل فرمائی جس کا شانِ نزول یہ ہے کہ مکہ کے سردار اور رؤساء نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ہم آپ کی بات اس شرط پر سننے کو تیار ہیں کہ جس وقت ہم لوگ آپ

کی مجلس میں حاضر ہُوا کریں تو آپ ان غریب اور کم درجہ کے لوگوں کو اپنے پاس سے اُٹھا دیا کریں کیونکہ ہم کو اُن کے ہمراہ بیٹھنے میں سخت عار آتی ہے اور ہماری شان کے خلاف ہے کہ ہم اتنے بڑے لوگ ایسے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ بیٹھیں۔ جب ان لوگوں نے آپ سے یہ درخواست کی تو آپ اس سلسلہ میں متردد تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی:

لا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ۔	"آپ (اپنے پاس سے) ان لوگوں کو الگ نہ کریں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں جس سے اُن کی غرض یہ ہے کہ وہ خالص خدا تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں۔"

یعنی اُن کی عبادت اور اللہ کو پکارنا محض اخلاص اور نیک نیتی سے ہے اور کوئی غرض اُن کی اس میں شامل نہیں۔ یہی مطلب ہے لفظ "یریدون وجہہ" کا۔ تو خدا تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ آپ اِن لوگوں کو اپنے پاس سے ان سردار اور رؤسا کی خاطر سے نہ اُٹھا دیں خواہ یہ سردار آپ کے پاس آئیں یا نہ آئیں۔

اب اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اخلاص اور نیک نیتی کی خدا تعالیٰ کے ہاں کتنی قدر ہے اور اس کا کتنا مرتبہ ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ نعوذ باللہ نبی کو امیروں سے ان کی امارت کی بنا پر محبت اور اُنس ہو اور غریبوں سے اُن کے افلاس اور فقر کی وجہ سے نفرت ہو بلکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو اس میں متردد تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو یہ حرص تھا کہ اگر میں چند منٹ کے لیے ان سردارانِ مکّہ کی اس بات کو مان لوں اور تھوڑی دیر کے لیے دعوتِ اسلام کی خاطر ان سے تخلیہ میں گفتگو کر لوں تو ممکن ہے کہ یہ اسلام لے آئیں اور اسطرح

اُن کو ہدایت ہو جائے پھر یہ اُمرا امراء نہیں رہیں گے بلکہ دل سے ویسے ہی درویش
صفت ہو جائیں گے جیسے کہ یہ فقراء مسلمین ہیں تو گویا آپ کا خیال مبارک یہ تھا کہ یہ چند
روز کی بات ہے پھر جب خُدا تعالےٰ ان کو اسلام لانے کی توفیق دے گا تو پھر یہ
معاملہ ہی نہیں رہے گا۔ غرض آنجناب کو جو اس طرف میلانِ خاطر تھا وہ اس بناء
پر تھا کہ آپ ان اُمراء کو فقراء صفت بنانا چاہتے تھے اور فقراء مسلمین چونکہ سرتاپا
جاں نثار اور غلام تھے اس لیے اُن کو کسی طرح کی گرانی ہونے کا خدشہ نہیں تھا۔ یہ
مصالح تبلیغ و دعوت تھیں جن کی بناء پر آپ کا خیال مبارک اس بارے میں متردد تھا
مگر چونکہ خدا تعالےٰ کی شان بے نیاز ہے اور اس کی بارگاہ میں کسی کی پرواہ نہیں۔ اس
لیے فرمایا کہ خواہ یہ امراء اسلام لائیں یا نہ لائیں آپ پرواہ نہ کریں۔ لیکن ان مسلمانوں
کو جو اخلاص اور نیک نیتی سے صبح و شام اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دربار میں سے
نہ ہٹائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خُدا تعالےٰ نے جو یہ اتنا بڑا اعزاز و اکرام ان
فقراء مسلمین کا فرمایا اور ان کو اِن سرداروں کے مقابلہ میں اتنا بڑا مرتبہ عطا فرمایا
اُس کی علت کیا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟ سو اس کی علت خود حق تعالےٰ فرما
رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یریدون وجھہ۔

یعنی یہ مرتبہ ان کو اس لیے عطا کیا جا رہا ہے کہ یہ خدا تعالےٰ کی عبادت
محض اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو اس کی رضا اور خوشنودی کی تلاش ہے۔ کوئی
دنیوی غرض یا اپنی ذاتی خواہش نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے
جو اپنی نیتوں کو خُدا کی رضا جوئی کے لیے خاص کر لیا تھا اس اخلاص اور نیک
نیتی کی یہ برکت ہے کہ ان کو اس مرتبۂ عظمےٰ پر فائز کیا گیا اور فقط اسی پر اکتفا
نہیں فرمایا بلکہ یہ حکم دیا: و اذا جاءک الذین یؤمنون بایاتنا فقل

سلام علیکم کتب ربکم علیٰ نفسہ الرحمۃ انہ من عمل منکم الخ۔

اس میں بھی یہی ذکر ہے کہ جب یہ فقراء آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کو سلام کیجئے اور ہمارا یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ خدا تعالےٰ نے ان لوگوں پر رحمت نازل کرنے کو اپنے اُوپر لازم فرما لیا ہے اور یہ انعام بھی اس نیک نیتی اور اخلاص کی بنا پر ہو رہا ہے کہ جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ لوگ آئیں تو نبی ان کو سلام کریں اور خدا تعالےٰ کی درگاہ میں حاضر ہوں تو وہ ان پر رحمت فرمائیں اور تیسرا اعزاز یہ کہ امراء آئیں یا نہ آئیں کوئی پرواہ نہیں مگر ان لوگوں کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھانا گوارا نہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ :-

نیۃ المؤمن خیر من عملہ ”مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے“

(رواہ الطبرانی من حدیث سہل بن سعدؓ)

اس حدیث کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے جو درحقیقت اختلاف نہیں بلکہ اس حدیث کی مختلف تفسیریں اور تعبیریں ہیں۔ دراصل بظاہر اس حدیث میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ عمل کرنے سے نیت کا درجہ کیسے بڑھ سکتا ہے کیونکہ نیت تو عمل سے پہلے ہوتی ہے پھر اس میں مشقت بھی کچھ نہیں اور عمل میں مشقت ہے اس لیے بعض علماء نے اس کا یہ مطلب بیان فرمایا کہ انسان کئی قسم کے ہیں ایک وہ جو نیک نیت کرے اور عمل نہ کرے اور دُوسرا وہ جو عمل کرتا ہے مگر نیت ٹھیک نہیں ہے۔ مثلاً عمل میں ریاء کا شائبہ ہے یا کسی دنیوی غرض کو حاصل کرنے کے لیے نیک کام کر رہا ہے تو چونکہ اس دُوسرے شخص کی نیت ٹھیک نہیں۔ اس لیے اس کے عمل کا بھی کوئی ثواب نہیں رہا بلکہ ریاء وغیرہ کا گناہ ہوا بخلاف اس شخص کے کہ جس نے صرف نیت کی تھی، اس کو نیت کا ثواب تو مل گیا گو وہ عمل

نہ کر سکا اور پہلے شخص کو نیت کا ثواب ملا نہ عمل کا۔ تو اس صورت میں نیت عمل سے بڑھ گئی۔ کیونکہ بہر حال وہ نیت ثواب کا باعث ہوئی اور یہ عمل کچھ بھی نہ ہوا۔ اور بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ چونکہ عمل تو ہوتا ہے محدود اور نیت انسان غیر محدود کی بھی کر سکتا ہے تو اس صورت میں نیت عمل سے بڑھی ہوئی ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ ایک تو ایسا شخص ہے کہ جس کو خدا تعالےٰ نے مال بھی عطا فرمایا ہے اور علم بھی۔ اب وہ اپنے مال کو اپنے علم کے مطابق صحیح جگہوں میں خرچ کرتا ہے یعنی جہاں پر خرچ کرنے کا حکم ہے وہاں تو خرچ کرتا ہے اور جہاں خرچ کرنے کی ممانعت ہے وہاں خرچ کرنے سے رُک جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ اُس کو اجر اور ثواب بہت ملے گا۔ کیونکہ جہاں جہاں اُس کو خرچ کرنے کی ضرورت محسوس ہو گی دل کھول کر خدا کی راہ میں خرچ کرے گا۔ اور ایک دُوسرا شخص ہے کہ اُس کے پاس نہ مال ہے اور نہ علم ہے۔ اور وہ اُس کو دیکھ دیکھ کر حسرت کھاتا اور رشک کرتا ہے کہ کاش! خدا تعالےٰ مجھ کو بھی اسی طرح مال دیتا اور میں اُس کو خدا کی راہ میں اس شخص کی طرح خرچ کرتا۔ تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

هما فی الاجر سواء "یہ دونوں اجر اور ثواب میں برابر ہیں"۔

وجہ یہ ہے کہ اس دُوسرے کے پاس اگرچہ مال و دولت نہیں ہے مگر اس کی نیت تو ہے کہ اگر ہوتا تو میں خرچ کرتا۔ تو چونکہ یہاں اس کی نیت شامل ہو گئی اس لیے اجر و ثواب میں اُس کے برابر کر دیا گیا۔ اور تیسرا وہ شخص ہے کہ خدا تعالےٰ نے اُس کو مال دیا مگر اُس نے علم حاصل نہیں کیا اس لیے اپنے مال کو اندھا دھند عیش پرستیوں اور فضول خرچیوں میں صرف کر رہا ہے۔ اور کسی مفلس آدمی نے اس کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ یہ شخص تو خوب مزے اڑا رہا ہے

اس لیے اس نے بھی یہ حسرت کی کہ مجھے مال ملے تو میں بھی یوں ہی عیش اڑاؤں اور دُنیا کے مزے لُوں۔ فرمایا کہ یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ تو یہ برابری محض نیّت کی وجہ سے ہوئی۔ اس لیے انسان کو چاہیئے کہ اگر کسی کو نیک کاموں میں خرچ کرتے دیکھے تو کہے کہ اگر مجھے بھی مال میسّر ہوتا تو میں بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتا۔ اور کسی کو دیکھو کہ وہ اپنے مال کو بے جا خرچ کر کے گناہ میں مُبتلا ہے تو یہ کہو کہ خداوندا تیرا احسان ہے اور شکر ہے کہ تُو نے مجھے دیا ہی نہیں کہ میں اس خرافات میں خرچ کرتا۔ بعض اولیاء کرام کے کلام میں دیکھا کہ دو چیزیں عجیب و غریب ہیں۔ ایک توبہ اور دوسری نیّت اور یہ دونوں عجیب و غریب اس لیے ہیں کہ نیّت کا کام ہے کہ معدوم چیز کو موجود بنا دینا۔ مثلاً ہم نے کوئی عمل نہیں کیا۔ مگر نیّت نے اس کو موجود کر دیا۔ اور دُوسری چیز توبہ ہے جو موجود کو معدوم کر دیتی ہے۔ کیونکہ انسان خواہ ستر برس تک گناہ کرتا رہے بلکہ شرک و کفر میں مُبتلا رہے۔ جب بارگاہِ الٰہی پر ایک سجدہ کیا اور معافی مانگی سب یک قلم معاف اور گناہوں کا ایک بے شمار ذخیرہ جو موجود تھا اس کو ایک مخلصانہ توبہ نے معدوم کر ڈالا۔ یہ دو نعمتیں خدا تعالےٰ نے اہلِ ایمان کو عطا کی ہیں عجیب نعمتیں ہیں فللّٰہ الحمد حمداً کثیراً۔

جو حدیث ابتدا ہی میں مَیں نے پڑھی ہے اس میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمارہے ہیں کہ اعمال کا دارو مدار نیّت پر ہے یعنی اعمال بمنزلہ جسم کے ہیں اور نیت بمنزلہ روح کے ہے۔ جس درجہ کی نیّت ہو گی اسی درجے کا عمل ہوگا اگر اچھی نیّت ہے تو عمل بھی اچھا ہوگا اور فاسد نیّت ہے تو عمل بھی فاسد ہو گا اس سے بھی نیت المومن خیر من عملہ کا نیا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ

جب نیّت بمنزلہ روح کے ہے اور عمل بمنزلہ جسم۔ تو ظاہر ہے کہ روح کا درجہ
جسم سے بڑھا ہُوا ہے۔

آج کل کے فلسفیوں کو اور مادہ پرستوں کو اس جگہ یہ اشکال پیش آیا
کرتا ہے کہ یہ باتیں محض مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں اور محض سُنی سُنائی باتیں ہیں۔
اور اس کے لیے کوئی عقلی دلیل نہیں۔ کیونکہ عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے منکر ہے
کہ عمل کا دار و مدار نیّت پر ہو لیکن ان کا یہ خیال غلط ہے، اس کے واسطے عقلی دلیل
بھی موجود ہے۔

دیکھئے آپ باپ ہونے کی حیثیّت سے اپنے بچّے کے طمانچہ مار دیں تو اس
سے اس بچّے کے دل میں جو آپ کی محبّت ہے اُس میں کوئی فرق نہیں آئے گا
لیکن اگر آپ کسی بچّے کے طمانچہ مار دیں تو اس بچّے کو بھی ناگوار ہو گا اور اس
کے والدین اور سرپرستوں کو بھی ناگوار گزرے گا۔ سوچنا چاہیئے کہ آخر یہ فرق
کیوں ہوا۔ وہی نیّت کا فرق ہے کہ اپنے بچّے کو مارنے میں اس کی اصلاح
اور تربیت مدِّ نظر ہے اور محلے کے بچّے کو مارنے میں یہ چیز نہیں ہے۔
اسی طرح کسی شخص سے نادانستہ کسی کا نقصان ہو جائے کہ اس کی نیّت
اور ارادہ اس نقصان کرنے کا نہیں تھا۔ مگر لاعلمی اور غیر اختیاری طور پر وہ
نقصان ہو گیا۔ اگر یہ دُوسرا شخص عدالت میں دعوےٰ دائر کرے اور عدالت کو
یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ کام اُس نے قصداً نہیں کیا بلکہ نادانستہ ہو گیا
ہے تو عدالت اس کو سزا نہ دے گی اور اگر دے گی تو اس درجہ کی سزا نہ دیگی
جیسی کہ قصداً میں دی جاتی تو جب دُنیا کے احکام نیت سے بدل جاتے ہیں
تو آخرت کے احکام کے متعلق اگر نبی خبر دے تو اس میں کیوں شک ہے؟

حدیث "نیتہ المؤمن خیر من عملہ" کی ایک توجیہ علماء نے یہ کی ہے کہ نیّت ایک ایسا فعل ہے کہ اس میں ریاء کا احتمال نہیں۔ اس لیے یہ عمل سے بہتر ہے کیونکہ عمل میں ریاء کا احتمال ہے اور ایک توجیہہ اس کی امام غزالیؒ نے لکھی ہے وہ یہ کہ عمل کا تعلق تو اعضائے ظاہری سے ہے اور نیّت کا تعلق باطن سے ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اطباء جو مریضوں کو دوا دیتے ہیں اُن میں بعض تو اوپر لیپ کرنے کی ہوتی ہیں اور بعض دوائیں پلانے کی ہوتی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ جو دوا جسم کے اندر پہنچ کر اپنا اثر کرے گی وہ زیادہ مؤثر ہوگی بہ نسبت اُس دوا کے جو اُوپر سے لیپ کے طور پہ لگا دی جائے۔ اسی طرح نیّت اور عمل کا حال ہے۔

اب یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ لفظ "نیت" کے کیا معنی ہیں؟ سو نیّت کے معنی لغت میں قصد کرنے اور ارادہ کرنے کے ہیں۔ مگر حقیقت اس کی قصد اور ارادہ کے سوا کچھ اور ہے۔ یوں سمجھئے کہ نیّت کی حقیقت یہ ہے کہ نیّت ایک قلبی صفت اور کیفیّت کا نام ہے جو علم اور عمل کے درمیان میں ہے۔ اس کو مثال سے سمجھئے کہ مثلاً پہلے تو انسان کو علم حاصل ہوتا ہے کہ فلاں کام میں نفع ہے یا نقصان ہے جیسے تجارت میں نفع ہونے کا کسی کو علم ہو کہ اگر تجارت کی جائے تو نفع ہوتا ہے یا کھیتی کرنے سے غلّہ پیدا ہوگا۔ یہ تو سب سے پہلا درجہ ہے جو علم کا درجہ کہلاتا ہے۔ دُوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان عمل شرُوع کر دے۔ جیسے تجارت کا مال خرید کر دکان میں لگا کر بیٹھ جائے یا کھیتی کرنے کے لیے ہل وغیرہ چلانا شروع کر دے یہ عمل کا درجہ ہے اور ان دونوں کے یان جو چیز ہے وہ نیت ہے یعنی علم کے بعد جو طبیعت میں اس کام کے

کرنے کی آمادگی پیدا ہوئی بس یہی نیت کا درجہ ہے۔ امام غزالیؒ نے اس کی تعریف اور حقیقت کو دو لفظوں میں بیان فرمایا ہے :۔

انبعاث القلب الی ما یراہ موافقا لغرضہ عن جلب منفعة اور دفع مضرة حالا او مآلا ۔

یعنی کسی کام کے لیے دل کا کھڑا ہو جانا اور آمادہ ہو جانا کہ جس کو دل اپنی غرض کے موافق پاتا ہے خواہ وہ غرض جلبِ منفعت ہو یا دفع مضرت ہو عام ہے اس سے کہ وہ غرض فی الحال ہو یا فی المآل ہو اور اسی کے لیے فرماتے ہیں کہ اعمال کا دارومدار دل کے کھڑے ہو جانے پر ہے۔ اگر دل خُدا کے لیے کھڑا ہو گیا تو وہی حکم ہو گا۔ اور اگر دُنیا کے لیے کھڑا ہو گیا تو وہی حکم ہو گا۔ غرض اعمال کی رُوح نیت ہے اگر نیت اچھی ہے تو عمل بھی مقبول ہے ورنہ مردود۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اعمال کی تین قسمیں ہیں :۔

قسم اول تو وہ اعمال ہیں جو طاعات کہلاتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ صدقہ اور خیرات وغیرہ۔

دُوسری قسم وہ ہے کہ جو مباحات کہلاتے ہیں۔ یعنی جن کے نہ تو کرنے سے گناہ ہے اور نہ ان کو ترک کرنے سے کوئی گناہ۔ جیسے کپڑے پہننا کھانا کھانا اور خوشبو لگانا وغیرہ۔

تیسری قسم اعمال کی معاصی ہیں یعنی وہ اعمال جن کے کرنے سے شریعت نے منع کیا ہے اور ان کے کرنے سے گناہ ہے۔

اب اس حدیث میں جو اعمال کا ذکر ہے اس سے اعمال طاعت اور اعمال مباح مُراد ہیں۔ معاصی یعنی اعمال معصیت اس سے مراد نہیں۔ مطلب یہ

ہے کہ اگر طاعات اور مباحات میں نیّت اچھی ہوئی تو نیّت کے مطابق اُن کی فضیلت بڑھ جائے گی۔ مگر گناہوں میں نیت خواہ کتنی بھی اچھی ہو وہ گناہ گناہ ہی رہے گا۔ مثلاً کوئی شخص چوری اس نیّت سے کرے کہ میں اس سے غریبوں کو کھانا کھلاؤں گا یا کوئی رشوت اس نیّت سے لے کہ میں مسجد بنواؤں گا۔ تو یہ چوری اور رشوت گناہ ہی رہیں گے اور اس پر کوئی ثواب مرتب نہ ہو گا۔ اس معصیت میں حسن نیت کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ عمل معصیت کے بنا پر وہ اچھی نیّت بھی فاسد ہو جائے گی طاعت میں نیت خالص اللہ کے لیے کرنی چاہیئے اور اس میں کوئی پابندی نہیں۔

ایک عمل میں جتنی نیّتیں کرلو گے اتنا ہی ثواب ملتا چلا جائے گا۔ مثلاً مسجد میں حاضر ہونا ہے یہ عبادت ہے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ یہ نیت بھی کرلے کہ خدا تعالےٰ کے حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہو رہا ہوں تو اس کو دو ثواب ملیں گے۔ اور اگر کسی نے اس کے ساتھ یہ نیت بھی کرلی کہ مسجد اللہ کا گھر ہے میں اس میں جا رہا ہوں اور جو کوئی کسی کے گھر جاتا ہے وہ اس کی زیارت کرنے کو جاتا ہے اس لیے میں اللہ کی زیارت کرنے کے لیے جا رہا ہوں تو ایک اجر اور مل جائے گا اور اگر کسی نے اُس کے ساتھ یہ نیت بھی کرلی کہ کسی کے گھر جانے سے انسان اُس کا مہمان ہوتا ہے تو میں خدا کا مہمان بننے کے لیے اور اس کی مہمانی کے مزے لُوٹنے کو مسجد میں جا رہا ہوں تو ایک اجر اور بڑھ گیا اور اگر کسی نے یہ نیت بھی کرلی کہ مسجد میں نیک لوگ اور فرشتے ہوتے ہیں لہٰذا اُن سے برکت بھی حاصل ہو گی تو اس صورت میں ایک اجر اور بڑھ جائے گا اور اگر کسی نے یہ بھی نیت کرلی کہ میں تو رُوسیاہ اور گنہگار ہوں اور وہاں پر اللہ کے مقبول

اور برگزیدہ بندے بھی ہوں گے اس لیے میری روسیاہی اور گناہ گاری ان کی برکت سے دُھل جائے گی تو اس نیّت کا ثواب بھی بڑھ جائے گا اور اگر یہ نیت بھی ساتھ ملا لے کہ جتنی دیر مسجد میں بیٹھوں گا گناہوں سے محفوظ رہوں گا تو ایک اور اجر بڑھ جائے گا اسی طرح قبلہ رو ہو کر بیٹھوں گا تو خانہ کعبہ کی سمت سے استفاضہ کروں گا اور برکت حاصل کروں گا تو ایک اس کا اجر اور بڑھ جائیگا۔ نیز فقہاء نے لکھا ہے کہ اعتکاف نفل چند گھنٹوں بلکہ چند منٹ کا بھی ہو سکتا ہے۔ تو اگر مسجد میں آنے کے وقت اعتکاف کی بھی نیّت کر لی تو اعتکاف کا ثواب بھی ملا۔ غرض اپنی عقل سے سوچ کر جتنی چیزوں کی نیت کرتے جاؤ گے اتنا ہی اجر بڑھتا جائے گا۔

آخرت کی تجارت میں اس عقل کو انسان کو خرچ کرنا چاہیئے۔ غرض اللہ تعالےٰ کا خزانہ کھلا ہوا ہے وہاں ایک ہی نیت نہ کرو بلکہ ایک ایک کام میں متعدد نیّتیں کرو تاکہ اجر بڑھتا چلا جائے۔ وہاں کوئی کمی نہیں نہ دینے میں اُن کو کوئی مشقّت ہوتی ہے۔ جیسے صدقہ و خیرات کرنا ثواب کا کام ہے مگر فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ صدقے کے مستحق سب سے زیادہ اپنے قریبی عزیز ہیں تو اگر کوئی صدقہ کرتے وقت اپنے عزیزوں کو دے اور یہ نیّت کرے کہ چُونکہ یہ ضرورتمند ہیں اس لیے اُن کو اپنی حاجت رفع کرنے کے لیے دے رہا ہوں تو اس طرح صدقہ کرنے کا اجر دوسرا صلہ رحمی کا اجر۔ تیسرا امداد فقراء کا اجر۔ غرض نیت کی ہی برکت سے یہ اجر حاصل ہوئے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے اعزہ کو صدقہ دینے کے بارے میں ایک اصول اور ضابطہ بنا رکھا تھا اور وہ یہ کہ بعض رشتہ دار تو انسان سے کسی وجہ سے

ناخوش رہتے ہیں اور بعض خوش اور راضی ہوتے ہیں تو آپ ان رشتہ داروں کو دینا پسند کرتے تھے۔ جو ناخوش رہتے ہیں اور قرآن مجید میں عباد مخلصین کے متعلق ارشاد ہے کہ ان کا مسلک یہ ہے :۔

لانرید منکم جزاء ولا شکورا ۔ "ہم صدقہ دے کر تم سے بدلہ اور شکر گزاری کے طلب گار نہیں ہیں"

تو چونکہ شکریہ کا طلب کرنا بھی ایک طرح کا بدلہ چاہنا ہے اس لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ روٹھے ہوئے رشتہ داروں سے شکر گزاری کی توقع نہیں ہوتی، اس لئے میں اُن کو دینا پسند کرتا ہوں ۔ یا مثلاً کوئی شخص بے نماز ہے اس کو اس نیت سے صدقہ دیا کہ جب میں اُس کو دوں گا تو یہ مجھ سے مانوس ہو جائے گا اور پھر میں اس کو نماز کے لیے ترغیب دے سکوں گا تو اس کا اجر بھی بڑھ جائے گا ۔ اسی طرح دُکان کھولنا، خوشبو لگانا، مکان بنانا وغیرہ یہ سب کام مباح ہیں نہ اُن کے کرنے میں کچھ گناہ ہے نہ ثواب ۔ لیکن اگر مثلاً دکان اس نیت سے کھولی کہ اس کے ذریعہ سے روپیہ کماؤں گا اور غرباء اور مساکین کی مدد کروں گا اور مسلمانوں کی ضروریات مہیا کروں گا تاکہ ان کو سہولت ہو اور کافروں سے خرید کی مسلمانوں کو ضرورت نہ رہے اور اس کی وجہ سے مجھے دُنیا والوں سے استغنا ہو جائے گی اور روپیہ خدا کی راہ میں اور جہاد میں خرچ کروں گا۔ تو اب یہ دکان صرف تجارت گاہ نہیں بلکہ عبادت گاہ بن گئی ہے ۔

تو حضرات دیکھئے کہ نیت کی برکت سے تجارت بھی عبادت بن گئی ۔ اب اس کا ہر ہر لمحہ گویا عبادت میں گزر رہا ہے ۔ پھر اگر خدا کسی کو تجارت

میں نفع دے اور خدانخواستہ اس کے دل میں تکبّر اور علو پیدا ہو جائے
تو یہ وبال ہیں۔

مثلاً آپ اپنی دُکان پر بیٹھے ہیں سامنے میز بچھی ہے۔ بجلی کا پنکھا چل رہا
ہے سامنے ٹیلیفون رکھا ہے اور سامنے سڑک پر کوئی گدا فقیر خستہ حال گزر را
تو اُس کو دیکھ کر اپنی حالت پر ناز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے
کہ اُس کا لاکھ لاکھ احسان اور کرم ہے کہ اس نے محض اپنی رحمت سے
مجھے اتنا دے رکھا ہے۔

وہ اگر چاہتا تو اس کے برعکس بھی کر سکتا تھا۔ ایسے وقت میں بجائے
تکبّر اور فخر کے شکر کرنا چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ میرا فرض ہے کہ ایسے
ناداروں کی خبر گیری کروں اور مجھ پر جو خدا تعالےٰ کی نعمتیں مبذول ہیں
ان کا شکر ادا کروں۔

حضرت حسن بصریؒ ________ فرماتے ہیں کہ قیامت کے بعد
جہنمی جہنم میں اور جنتی جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے جس کی کوئی مُدت
متعین نہیں۔ حالانکہ جن لوگوں کو جہنم میں بھیجا جائے گا ان کے اعمالِ کُفر
محدود ہیں اور جن کو جنت میں بھیجا جائے گا اُن کے اعمال صالح بھی محدود
ہیں تو اس محدود کی جزاء لامحدود کیوں مقرر کی گئی۔ حضرت حسن بصریؒ نے
اس اشکال کا یہی جواب دیا ہے کہ چُونکہ عمل کرنے والے کی نیت دوام کی
تھی اس لیے جزاء بھی دائمی مقرر ہوئی۔ کافر کی نیت یہ تھی کہ اگر ایک کروڑ سال
کی عمر ملے تو کفر ہی پر قائم رہوں گا۔ اسی طرح مومن کی بھی یہی نیّت ہے کہ
کتنی ہی عمر دراز کیوں نہ ہو ایمان پر قائم رہوں گا۔ نیّت چُونکہ دوام کی ہے اس

لیے جزا بھی دائمی ہے۔ آج کل زمانہ ایسا ہے کہ لوگ دین اور عمل کے نام سے گھبرانے لگے ہیں۔ کیونکہ کہتے ہیں کہ نیّت خالص کیسے ہو سکتی ہے۔ سو انسان کو گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ عمل شروع کرنے سے قبل ایک دفعہ اپنی نیّت درست کر لے پھر بار بار نیّت کرنے کی ضرورت نہیں

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کو چاہیئے کہ عمل شروع کرنے سے قبل اپنی نیت درست کر لے۔ بعد میں اگر نیّت میں کچھ خلل آئے تو پرواہ نہ کرے۔ شیطان اگر وسوسہ ڈالے تو التفات نہ کرے جواب جاہلاں باشد خموشی۔

ایک بزرگ تھے انہوں نے اپنے شیخ سے عرض کیا کہ حضرت عجب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ نفلیں پڑھنے کو دل چاہتا ہے مگر جب پڑھنے کھڑا ہوتا ہوں تو ریاء ہوتی ہے اور اگر ریا کی وجہ سے نہ پڑھوں تو نفلوں سے محروم رہتا ہوں۔ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟

شیخ نے کہا کہ نفلیں تو ریا سے پڑھ لیا کرو اور بعد میں ریا سے توبہ کر لیا کرو۔ سو اس حکایت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو نیک کام کرنا ہو کر گزرے اور بعد میں اگر محسوس ہو کہ اس میں ریاء و نمود کا ذرا بھی شائبہ ہے تو اس سے استغفار کر لے۔ توبہ اور استغفار سیئات کو حسنات سے بدل دیتی ہے۔ نیت کی ایک عجیب فضیلت قرآن مجید سے سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ قرآن مجید میں ہے کہ جب شیطان مردود ہوا اور وہاں سے نکالا گیا تو اس نے کہا :۔

فبعزتک لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین۔	"قسم ہے تیری عزت و جلال کی میں یقیناً ضرور ان کو یعنی اولاد آدم کو گمراہ کر دوں گا۔ مگر ان میں سے جو تیرے مخلص بندے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان سے بچنے کا راستہ سوائے حسن نیت اور اخلاص کے اور کوئی نہیں ہے اور اس میں کوئی مشقت نہیں کہ نیت کو کام کرنے کے وقت خالص کر لیا جائے اور اس کے بعد بھی اگر کسی کے دل کو تسلی نہ ہو اور دل اس سے مطمئن نہ ہو تو سمجھ لے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے جو اس طرح مجھے نیک کام کرنے سے روک رہا ہے۔ ایسے وقت میں وہ اس سے کہہ دے کہ مجھے تیری کچھ پرواہ نہیں۔ تو کتنا ہی مجھے بہکا اور میرے پیچھے پڑیں تو یہ کام کر کے چھوڑوں گا اور اگر پھر بھی دل میں کچھ خلش رہ جائے تو خدا سے دعا کرے کہ اے اللہ! میں کمزور ہوں میری دستگیری فرما۔

ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا کہ ان کو حکومت وقت نے جیل میں بند کر دیا تو جیل میں ان بزرگ کا معمول تھا کہ جب جمعہ کا دن آتا تو غسل کرتے کپڑے بدلتے اور جب اذان کی آواز آتی تو جیل خانے کے دروازے تک تشریف لے جاتے اور پھر لوٹ آتے لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ فرمایا کہ قرآن مجید میں ہے کہ :۔

اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی	"جب جمعہ کے دن اذان ہو جائے تو تم اللہ تعالےٰ کی یاد کی

ذکر اللہ ۔ طرف دوڑو ۔

سو میں اس حکم کی تعمیل کرنے کے لیے تیاری کرتا ہوں اور جہاں تک جا سکتا ہوں چلا جاتا ہوں ۔ تو اس طرح ان بزرگ کو جمعہ کی نماز پڑھنے کا ثواب مل جاتا تھا ۔ لہٰذا لوگوں کو چاہیئے کہ وہ شیطانی وسوسوں کی پرواہ نہ کریں اور کہہ دیں کہ میں تو اللہ تعالٰے کے لیے اس کام کو ضرور کروں گا ۔ تو بلا سے راضی ہو یا نہ ہو ۔

اب وقت ختم ہُوا ۔ دُعا کیجیئے کہ اللہ تعالٰے ہماری نیتوں کو دُرست فرمائے اور حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین یارب العالمین ۔ و اٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین ۔

بتاریخ ۳۰ صفر المظفر ۱۳۷۹ھ ۔ ۴ ستمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ یہ وعظ مسجد نیلا گنبد میں ہوا ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وعظ نمبر ۲

اخلاص کی فضیلت
اور
اُس کی حقیقت

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سئیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ۔

اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

وَمَا اُمِرُوا اِلَّا لِیَعبُدُوا اللہ مخلصین لہ الدین حُنفاء ویقیموا الصلوۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذالک دین القیمۃ۔

گذشتہ جمعہ کے بیان میں نیّت کے متعلق ذکر تھا اور اس سلسلہ میں ایک حدیث اور قرآن مجید کی آیت تلاوت کی تھی۔ حدیث:۔

انما الاعمال بالنیات   اعمال کا دارومدار نیّت پر ہے۔

میں کئی مضمون مذکور ہیں جن میں سے نیت کے متعلق بیان ہوا تھا اور اسی ضمن میں

کچھ عمل کا ذکر بھی ہو گیا تھا۔ نیت کی حقیقت سمجھانے کے لیے چند مثالیں بھی دی تھیں اس وقت ایک اور مثال ذہن میں آئی ہے جس سے نیت کی حقیقت اور عمل کی حقیقت زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی۔ مثال یہ ہے کہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں بیٹھے ہوئے ہیں کہ اچانک آپ کے سامنے کسی قسم کا کھانا یا کوئی پھل وغیرہ آیا اور آپ کی اس پر نظر پڑی اور نظر پڑنے کے بعد اس کے کھانے کی خواہش پیدا ہوئی اس کے بعد آپ نے اس کو کھا لیا تو اس صورت میں اس کھانے کی چیز مثلاً گوشت یا حلوے پر جب آپ کی نظر پڑی اور آپ نے اس کو دیکھ لیا تو گویا آپ کو اس کے وجود کا علم ہو گیا اور آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ حلوہ موجود ہے۔ یہ درجہ علم کا ہوا۔ اس علم کے بعد خدا تعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں ایک درجہ میلان اور رغبت کا رکھا ہے۔ یعنی جب کوئی مرغوب شئے اس کے علم میں آتی ہے تو اس میلان اور رغبت کی قوت کو حرکت ہوتی ہے اور دل انسان کا اس چیز کی طرف جھکتا ہے یہ درجہ میلان اور رغبت کا ہے اور جب یہ رغبت پیدا ہوئی تو یہ انسان کی قوت ارادیہ اور اختیاریہ کو حرکت دیتی ہے۔ یعنی انسان کے اختیار کو برانگیختہ کرتی ہے کہ وہ اپنے اختیار سے جوارح کو حرکت دے اور اس چیز کو حاصل کرے۔ پھر انسان اس چیز کو لے کر مثلاً کھا لیتا ہے۔ تو جب جوارح اور اعضاء حرکت میں آجاتے ہیں تو یہ درجہ عمل کا ہوتا ہے اور اس سے قبل جو رغبت پیدا ہوتی ہے بس اسی رغبت کے اٹھ کھڑے ہونیکا نام نیت ہے۔ بس جو پختہ رغبت اور میلان انسان کو ہاتھ پاؤں ہلانے پر آمادہ کرتا ہے اسی کو نیت کہتے ہیں۔ غرض یہ چار مراتب ہیں۔ اوّل علم۔ دوسرے میلان و رغبت۔ تیسرے قوت وارادہ اور چوتھے عمل اور ان چاروں کا ذکر حدیث کے

اوّل کے ٹکڑے میں آگیا۔ یعنی "انما الاعمال بالنیات" میں۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

وانما لامرئٍ مانوی ۔ "انسان کو وہی ملے گا جو اس کی نیت ہو گی"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جملے میں تو اعمال کا حکم بیان فرمایا کہ جیسی نیت کرو گے ویسا ہی عمل سمجھا جائیگا۔ اگر اچھی نیت کی ہے تو عمل بھی اچھا ہے اور بری نیت کی ہے تو عمل بھی بُرا ہے اور یہ جملہ اعمال کے ثمرات اور ان کی جزاء کو بیان کرنے کے لیے فرمایا۔ یعنی انسان کو عمل کا ثمرہ اور اس کا بدلہ اسی قسم کا ملیگا جیسی اس کی نیت ہو گی اور حدیث کے اگلے حصے میں مقصود کا ذکر ہے۔ یعنی :-

فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا اوامرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجرالیہ۔

"جس کی ہجرت (سے نیت) خدا اور اس کے رسول کی طرف ہو گی تو اسکی ہجرت بھی خدا اور رسول کی طرف ہو گی اور جس کی نیت ہجرت کرنے سے دنیا کی ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنیکی تو اسکی ہجرت اسی جانب ہو گی جسکی جانب اس نے ہجرت کی"۔

اس میں مقصد کا ذکر ہے یعنی یہ دیکھو کہ عمل کا محرک کیا ہے؟ آیا خدا تعالےٰ کی خوشنودی اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہو یا کسی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کو کر رہے ہو۔ اگر خدا کی رضا اور خوشنودی اور آخرت کے لیے کر رہے ہو تو اس کو دیکھ لو اور اگر دُنیا کے لیے کر رہے ہو تو اس کو دیکھ لو۔

انبیاء علیہم السلام دین کا راستہ بتانے اور بندوں کو خدا تک پہنچانے کا طریقہ بتانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس لیے یہ بات بتا دی کہ صرف عمل ہی پر نظر نہ رکھو بلکہ یہ بھی دیکھ لو کہ عمل کا محرک کیا ہے اور اس کے کرنے میں نیت کیا ہے؟ اگر عمل میں اخلاص ہے تو ٹھیک ہے ورنہ نہیں۔ اور اخلاص کے معنی

لغت میں ہیں "کسی چیز کو خالص کر دینا" یعنی اس میں کسی دوسری چیز کا شائبہ اور آمیزش بھی نہ ہو۔ دودھ کو خالص جب ہی کہہ سکیں گے جبکہ وہ دوسری کسی قسم کی ملاوٹ سے پاک ہو۔ تو شریعت کی اصطلاح میں اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ عمل کو خالص خدا کے لیے کرنا۔ کسی دوسری چیز کا اس میں شائبہ اور آمیزش بھی نہ ہو۔

حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ جو ایک بہت بڑے صوفی اور کامل بزرگ ہوئے ہیں انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "منطق الطیر" اس میں وہ پرندوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک شعر ہے ؎

چیست اخلاص آنکہ از غیر خدا فرد آئی در خلا و در ملا

یعنی ظاہر و باطن، چھپے اور کھلے خدا ہی کے لیے کام کرو جس میں اور کسی کا شائبہ نہ ہو۔

اس حدیث کا شانِ ورود اور شانِ ظہور یہ ہے کہ ایک شخص جو بعد میں صحابی ہوئے انہوں نے ایک مسلمان عورت سے جن کا نام ام قیس تھا نکاح کا ارادہ کیا اور ان کو پیغام بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ مَیں تم سے کس طرح نکاح کر سکتی ہوں تم کافر ہو اور مَیں غیر مسلم سے نکاح نہیں کر سکتی۔ ہاں البتہ اگر اسلام لے آؤ اور ہجرت کرو تو ممکن ہے۔ چنانچہ یہ شخص ایمان لے آئے اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کی اور ام قیس سے نکاح کر لیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ

"جو شخص کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کرے تو اس کی ہجرت اسی غرض کے لیے سمجھی جائے گی جس کے لیے اُس نے ہجرت کی ہے"

اس جگہ ایک ضروری اور اہم بات سمجھ لینے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں غور کرنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نہ کسی

ثواب کا ذکر فرمایا ہے نہ عقاب کا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اگر کوئی شخص خدا اور رسول کے واسطے اور اخلاص نیت کے ساتھ ہجرت کریگا تو اس کو یہ یہ ثواب ہوگا اور اگر کوئی دُنیا کے واسطے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کرے گا تو اس کو ایسا ایسا عذاب ہوگا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مُراد یہ ہے کہ اگر کسی عبادت کے ساتھ کسی دُوسری چیز کا شائبہ ہوگیا تو اگر وہ چیز کوئی معصیت ہے پھر تو گناہ ہوگا اور اگر وہ کوئی امر مباح ہے تو نہ کوئی ثواب ہوگا نہ عقاب ہوگا۔ اس حدیث میں ان صحابی نے نکاح کرنے کی خاطر ہجرت کی سوچونکہ نکاح کرنا ایک امر جائز ہے اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ گناہ گار ہوگا۔ بلکہ جس درجہ کی ہجرت ہے اسی درجہ کا اس کا ثواب ہوگا۔

"فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ" میں عظمت شان بتادی۔ یعنی جس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہوگی اس کا کیا کہنا۔ یعنی اس کی ہجرت اعلےٰ درجہ کی ہے اور جس کی ہجرت کسی دنیوی غرض کے لیے ہوگی وہ ایک حقیر چیز ہے۔ اس کو ایک اور مثال سے سمجھ لیجے کہ مثلاً اسلامی حکومت کی طرف سے جہاد کا حکم ہُوا۔ اب ایک شخص تو ایسا ہے کہ اُس نے جہاد کی اطلاع پاتے ہی تیاری کی اور خالص خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا اور اعلاء کلمۃ اللہ کا ارادہ کرکے خلوصِ دل کے ساتھ شرکت کا ارادہ کیا اور کسی نے جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ یہ ارادہ بھی کرلیا کہ کافروں کا ساز و سامان چھین کر لاؤں گا اور کسی نے مالِ غنیمت کا ارادہ کیا۔ تو اب ظاہر ہے کہ جس شخص نے خدا کی راہ میں جانفروشی اور جانبازی کی نیت کی ہے اس کا اجر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن جس شخص نے مال غنیمت کا ارادہ کیا ہے اس کو اگرچہ خالص جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب تو نہیں ہُوا۔ مگر کوئی گناہ بھی نہیں ہُوا۔ کیونکہ مال غنیمت حاصل کرنے

کی نیت کرنا کوئی گناہ نہیں۔ ایک صحابی کا واقعہ بلا سند کتابوں میں منقول ہے کہ انہوں نے جہاد میں جانے کے وقت کہا کہ فلاں کافر کے پاس جو گدھا ہے وہ بہت عمدہ ہے میں اس سے وہ گدھا چھین کر لاؤں گا۔ چنانچہ بعد میں ان صحابی کا لقب "قتیل الحمار" پڑ گیا تھا۔ اسی طرح آج کل بعض لوگ حج کے لیے جاتے وقت تجارت کی نیت سے جاتے ہیں۔ یا اپنے احباب وغیرہ سے ملنے جاتے ہیں۔ یا بعض لوگ اس غرض سے جاتے ہیں کہ وہاں سے نکاح کر لائیں گے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ ایک رفیق تھے وہ کہتے تھے کہ میں مکۂ معظمہ اس غرض کے لیے جا رہا ہوں کہ وہاں میری بیوی ہے اس کا خط آیا ہے کہ مجھ کو آ کر لے جاؤ تو میں اس کو لینے جا رہا ہوں۔ سو یہ بھی ایک غرض تھی سفر کی۔ سو اس کا حکم یہی ہے جیسا کہ قواعد شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو خالص حج کا ثواب تو نہ ملے گا مگر کوئی گناہ بھی نہ ہو گا۔ کیونکہ تجارت کرنا یا احباب سے ملنا یا نکاح کرنا یا بیوی کو لانا کوئی گناہ نہیں۔ غرض جب تک کسی معصیت کا اور گناہ کا ارادہ اور نیت نہ ہو گناہ لازم نہ آئے گا۔ اگرچہ اخلاص کے ثواب سے بھی محروم رہے گا۔ اور اسی سے آج کل کے ان لوگوں کا حکم بھی معلوم ہو گیا جو شہیدِ قوم اور شہیدِ وطن وغیرہ کے خطابات سے یاد کیے جاتے ہیں۔ شریعت میں شہیدِ قوم اور شہیدِ وطن کا کوئی مرتبہ اور کوئی حیثیت نہیں۔ شریعت میں شہید وہی ہے جو خدا کی راہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اپنی جان دے اور جو لوگ بلا لحاظ اسلام وطن اور قوم کے لیے اپنی جان دیتے ہیں ان کو اجر کی اُمید بھی وطن اور قوم ہی سے رکھنی چاہیئے۔ خدا کو اُن کی کوئی ضرورت نہیں جن کو خدا کے دین سے واسطہ نہیں خدا کو ان سے کیا واسطہ۔

یہاں تک تو ان لوگوں کا ذکر تھا کہ جو کسی طاعت میں اپنا مقصود ہی ان چیزوں کو

بنالیں۔ لیکن مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عبادت کے ساتھ ان چیزوں کو بھی ملالے یعنی عبادت بھی مقصود ہو اور کچھ اور بھی پیشِ نظر ہو کہ مثلاً حج بھی کرلیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرلیں گے سو ان لوگوں کا کیا حکم ہے؟ آیا اس غرض کے مل جانے سے ان کا اصل عمل ہی باطل ہو جائے گا یا اس کا بھی کچھ اجر و ثواب ملے گا اور یہ شخص مخلصین میں شمار ہوگا یا نہیں؟ سو جاننا چاہیئے کہ اگر کسی شخص نے طاعت کے ساتھ معصیت کو بھی ملالیا۔ مثلاً ریار و نمود کو تو پھر اس کا اصل عمل باطل ہو گیا اور اگر طاعت کے ساتھ کسی مباح چیز کی نیّت کو بھی شامل کرلیا تو بہت سے علمار تو اس طرف گئے ہیں کہ اس سے اس کا اخلاص ختم ہو گیا اور وہ عمل باطل ہو گیا۔ اور امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ:

"اس صورت میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ دونوں میں کون سا خیال غالب ہے؟ اگر آخرت کا خیال غالب ہے تو پھر یہ شخص مخلصین میں شمار ہوگا مگر ایک دوسری چیز کے شامل ہو جانے کی وجہ سے اس کے اخلاص میں کچھ کمی ضرور ہو جائے گی اور اگر دُوسرا خیال غالب ہے اور رضائے حق کا قصد مغلوب ہے تو پھر مخلصین میں سے شمار نہ ہوگا۔ اور اگر دونوں خیال برابر ہیں تب بھی مخلصین میں سے نہ ہوگا۔"

اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ:

"جس درجہ کی نیت اصل عمل کی ہو گی اسی درجہ کا اخلاص بھی حاصل ہوگا۔"

اور امام طبریؒ نے فرمایا کہ:

"ایسے آدمی کو چاہیئے کہ ابتدار میں خالص اللہ کے لیے نیت کرلے۔ اور بعد میں آنے والے وساوس کی پرواہ نہ کرے۔"

اور یہی میرے خیال میں سب سے عمدہ ہے اور جو لوگ حج بیت اللہ کے لیے جاتے ہیں اور وہاں کچھ تجارت وغیرہ بھی کرنا چاہتے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ تجارت کرنا بہرحال گناہ نہیں۔ اس لیے میرے خیال میں ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ خداتعالےٰ سے عرض کریں کہ " خداوندا میں دراصل تیری بارگاہ اور تیرے گھر کی زیارت کے لیے حاضر ہو رہا ہوں مگر یہاں بھی تیرے رزق کا محتاج ہوں اور وہاں پہنچ کر بھی تیرے رزق کا محتاج رہوں گا۔ یہاں بھی روزی حاصل کرنے کے لیے کچھ کام کرتا ہوں اور وہاں جاکر بھی کرونگا۔ گدائے بے نوا ہوں۔ آپ کے دروازہ پر مانگنے آیا ہوں۔ مقصودِ دل اور مطلوبِ جان آپ ہی ہیں اور یہ رزق عالم اسباب میں زندگی کا ایک سبب ہے۔"

غرض اصل نیت حج ہی کی کرے اور ضمناً دوسرا کوئی کام کرلے۔ اور خداتعالےٰ سے اپنا معاملہ ٹھیک رکھے۔ جیسا کہ حضرت موسےٰؑ کے قصے میں ایک جگہ قرآن مجید میں ہے :-

رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر۔ " اے اللہ! آپ نے جو کچھ میرے لیے خیر نازل کی ہے میں اس کا محتاج ہوں۔"

بندہ تو بہرحال خداتعالےٰ کی نعمتوں کا اور اس کے رزق کا محتاج ہے۔ اس لیے اپنی احتیاج کو پیش نظر رکھ کر درخواست کرے۔ اس کے علاوہ خانہ کعبہ جاتے ہوئے اور بھی نیتیں ملالے۔

مثلاً یہ کہ وہاں اور بہت سے خداتعالےٰ کے مخلص بندے ہوں گے ان کی برکت سے میرے اخلاص اور عمل میں قوت پیدا ہوگی اس طرح مختلف نیتوں کی برکت سے بہت سے ثواب اور فضیلتیں

حاصل ہو جائیں گی۔ اور جو شخص عالم ہو اس کو بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض اوقات شیطان انسان کو اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ وہ اس کی چال کو سمجھ نہیں سکتا اور عبادت کے رنگ میں اس سے گناہ کرا دیتا ہے۔

جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ عالم بھی تھے اور بزرگ بھی تھے۔ اور لیل و نہار خدا تعالےٰ کی عبادت میں لگے رہتے تھے۔ گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ سو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تم ہمیشہ گھر میں بیٹھے عبادت کیا کرتے ہو۔ خدا کی راہ میں نکلو اور جہاد میں جا کر شریک ہو تا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت حاصل ہو۔ چنانچہ یہ بزرگ اپنے گھر سے نکلے اور راستہ میں ان کو اس بات کا علم ہوا کہ در حقیقت یہ شیطان کا دھوکہ تھا اور اس طرح اس نے مجھے اپنے گھر سے نکالا ہے۔ کیونکہ شیطان یہی چاہتا تھا کہ ان کو ایک دفعہ گھر سے نکال لاؤں پھر تو ان کو مختلف طریقوں سے بہکا سکتا ہوں۔ وہاں گوشۂ تنہائی میں ان پر اس کا داؤ نہ چلتا تھا۔ اس لیے انسان کو چاہیئے کہ اپنی نیت کی نگرانی رکھے اور خالص خدا کے واسطے نیت رکھے اور دنیوی اغراض کو اس میں شامل نہ کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی اغراض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جائز اور مباح اور دوسرے حرام۔ سو اگر کسی کام میں حرام کی نیت شامل ہو گئی مثلاً مسجد بنوائی اور مقصد اس سے نام و نمود اور شہرت ہے تو یہ نیکی تو برباد ہوئی اور گناہ لازم ہوا۔ اور اگر کسی جائز چیز کی نیت اور ارادہ شامل کر لیا تو اس میں گناہ تو نہ ہوا مگر بہر حال اخلاص میں کمی تو آ گئی۔ اس لیے آدمی کو کوئی نیک کام شروع کرنے سے قبل پختگی کے ساتھ اپنی نیت کو درست کر لینا چاہیئے اور عمل خالص خدا کے لیے شروع کرنا چاہیئے۔ پھر اگر درمیان میں کچھ وساوس وغیرہ آدیں تو ان کی پرواہ نہ

کرے۔ اور اگر زیادہ دل پریشان ہو تو حدیث شریف میں ہے کہ " لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم " یعنی کسی نیکی کرنے کی کوئی توفیق اگر کسی شخص کو ہوتی ہے تو وہ خدا ہی کی مدد اور اعانت سے ہوگی اور اگر کسی کو گناہ سے بچنے کی طاقت بھی بجز اُس کی توفیق اور اعانت کے نہیں ہوسکتی۔ بس اگر کوئی خامی محسوس ہو تو خدا سے توبہ کرے اور اُس کی استعانت طلب کرے۔

امام ابو القاسم قشیریؒ نے لکھا ہے کہ شیطان پر اخلاص سے زیادہ کوئی چیز گراں اور شاق نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اخلاص کی وجہ سے شیطان کو اس عمل میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس لیے اس کی گرانی کا سبب ہوتا ہے۔ شیطان سے خلاصی کا ذریعہ صرف اخلاص ہے جس کو پہلے عرض کر چکا ہوں۔ فبعزتک لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین۔

اب خُدا تعالےٰ سے دعا کرو کہ وہ ہم کو نیک کاموں میں نیت درست کرنیکی اور اخلاص کی توفیق بخشے اور خُدا سے یوں کہو کہ " خداوندا! اگر تیری ہی مدد ہوگی تو ہم اخلاص کو حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ اگر خدانخواستہ تیری مدد نہ ہو تو ہم منافق اور ریاکار ہو جائیں گے۔ معاذاللہ۔ اے اللہ! ہم کو اخلاص عطا فرما اور ریاء اور نفاق سے محفوظ رکھ۔ آمین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔ امین۔

وعظ نمبر ۳

اِنسان کا غرور و تکبّر اور اُس کا عِلاج

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ
باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ
فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ
لاشریک لہٗ و نشہد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ و رسولہ
صلی اللہ علیہ و علیٰ اٰلہ و اصحابہ و ازواجہ و بارک و سلم۔
اما بعد - فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۞

لا اقسم بھذا البلد و انت حل بھذا البلد و والد و ما ولد لقد خلقنا الانسان فی کبد -

"میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی درانحالیکہ آپ رہنے والے ہیں اس شہر میں اور قسم ہے والد کی اور اس چیز کی جو جنا اس نے بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا ہے۔"

یہ سورۃ "بلد" کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ اِن میں خدا تعالےٰ نے مکّہ معظمہ کی قسم کھائی ہے اس سے قبل کئی دفعہ یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں حق تعالےٰ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس سے اس

چیز کے عظیم الشان اور معظم و محترم ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں جواب قسم کی دلیل ہوتی ہے۔ یعنی قسم کھا کر جس مضمون کو بیان فرما رہے ہیں اس کی دلیل اور ثبوت اس قسم میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جگہ ایک تو مکہ معظمہ کی قسم کھائی کہ "قسم ہے اس شہر کی، دراں حالیکہ آپ اس شہر میں رہنے والے ہیں"۔ اور دوسری قسم والد کی اور تیسری مولود کی یعنی اولاد کی۔ اور ان قسموں کے بعد جواب قسم یہ ہے کہ "ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا ہے"۔ اس جگہ جمہور علماء مفسّرین کی رائے یہ ہے کہ اس مقام پر "والد" سے حضرت آدم علیہ السلام مُراد ہیں۔ اور "ما ولد" یعنی "اولاد" سے ان کی کل اولاد مراد ہے۔ اس طرح خدا تعالےٰ نے اوّل سے لے کر آخر تک جتنے انسان پیدا ہوں اُن سب کی قسم کھائی ہے۔ آگے جواب قسم میں جو یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس سورت کا شانِ نزول سمجھ لیجیے۔

شانِ نزول اس سورۃ کا یہ ہے کہ جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی طرف دعوت دی اور لوگوں کو تبلیغ شروع کی تو آپ نے احکامِ اسلام لوگوں کو بتائے اور بتایا کہ جو شخص میری اطاعت کرے گا اس کے لیے جنت ہے جس میں انواع واقسام کے لذائذ اور ہر طرح کی راحت و آرام ہوگا اور جو شخص میری اطاعت سے روگردانی کرے گا اور کفر میں مُبتلا رہے گا۔ اس کے لیے جہنم ہے جس میں ایسے ایسے عذاب اور تکالیف ہیں اور اس پر انیس فرشتے مامور ہیں۔ جب آپ کی دعوت کی خبر عام ہُوئی تو مکہ معظمہ میں ایک شخص تھا جس کی کنیت ابو الاسدمی اور نام اس کا کندہ تھا مکہ میں رہتا تھا اور بہت طاقتور اور توانا آدمی تھا۔ اُس کی توانائی کا یہ عالم تھا کہ اگر گائے وغیرہ کا

دباغت دیا ہُوا چمڑہ بچھا کر اس پر اسے کھڑا کر دیا جائے تو اس کے نیچے سے اس چمڑے کو بیس آدمی بھی مل کر نہ نکال سکتے تھے۔ چمڑا پھٹ جائے مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹتا تھا اور مال و دولت کا کوئی شمار نہ تھا۔ بہت متمول اور مال دار انسان تھا۔ اس کے علاوہ اس نے متعدد نکاح کر رکھے تھے اور ایک سے ایک حسین و خوب صورت عورتیں اس کی زوجیت میں تھیں۔ اس کو بھی آپ کی دعوت و تبلیغ کی خبر پہنچی اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے اس کو بھی دعوتِ اسلام دی اور جنت کی ترغیب اور جہنم سے ڈرایا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ جہنم کے بارے میں ارشاد ہے :۔

وجعلنا جھنم للکفرین حصیرا "ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے جیلخانہ بنایا ہے۔"

اور دُوسری جگہ ہے :۔

علیھا تسعۃ عشر۔ "یعنی جہنم پر انیس فرشتے مامور ہیں۔"

یہ ساری باتیں سُن کر اس نے نہایت تکبّر اور غرور سے کہا کہ تم مجھے جہنم کے جیل خانہ سے اور اس بات سے ڈراتے ہو کہ اس پر انیس ۱۹ فرشتے ہیں۔ سو میں ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اُنیس ۱۹ کے لیے میں اکیلا کافی ہوں۔ ان سے نمٹ لوں گا اور رہا جنت کا (جنت کے معنی عربی زبان میں باغ کے ہیں) سو میرے پاس متعدد سر سبز و شاداب باغات ہیں اور جو تم کہتے ہو کہ اس میں حُوریں ہیں۔ تو میری زوجیت میں نہایت حسین و جمیل لڑکیاں موجود ہیں اس لیے مجھے نہ آپکی جنت کی ضرورت ہے اور نہ آپ کے بتائے ہُوئے جہنم سے کوئی ڈر ہے۔ نہ میں آپ کے طمع دلانے سے ڈگمگا سکتا ہوں اور نہ آپ کے خوف دلانے سے ڈر سکتا ہوں۔ سو اس شخص کو اپنی تین چیزوں پر تکبّر و غرور تھا جس کی وجہ سے اُس نے

یہ کلمات کفریہ اور متکبّرانہ کہے۔ اوّل طاقت۔ دوسرے مال و دولت۔ تیسرے عزّت وجاہت۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی تین چیزیں عموماً غرور، تکبّر اور نخوت کا باعث ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو ہمیشہ متکبّرین اور مغروروں نے جھٹلایا ہے اور اسی قسم کے لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے :۔

وقال الّذین استکبروا۔ "یعنی ان کی قوم کے متکبّر لوگوں نے اپنے نبی سے (انکا مقابلہ کرتے ہوئے) کہا۔

غرض اس شخص نے بھی آپ سے یہی کہا کہ کیوں مجھے ڈراتے اور طمع دلاتے ہو۔ خدا تعالےٰ کی طرف سے اس مغرور کے جواب میں پوری سورت نازل ہوئی جس کی ابتدائی آیتیں ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں۔ جس میں حق تعالےٰ جل شانہٗ نے سب سے پہلے مکّہ معظمہ کی قسم کھائی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مکّہ اللہ تعالیٰ کا نہایت معظم و محترم شہر ہے۔

علمائے مفسّرین نے لکھا ہے کہ خدا تعالےٰ نے جب زمین کو پیدا فرمایا تو سب سے پہلے خانۂ کعبہ کا نقطہ پیدا کیا اور یہیں سے پھر ساری زمین پھیلائی گئی اور بچھائی گئی۔ اس طرح کہ سب سے پہلے خانہ کعبہ جس جگہ ہے اُس کو بنایا پھر اُسکے پاس کا شہر بنایا اور پھر باقی روئے زمین بچھائی گئی اور بعض مفسّرین کے نزدیک تو آسمان کو پہلے پیدا کیا گیا اور زمین کو بعد میں۔ مگر جمہور علماء مفسّرین کی رائے یہی ہے کہ پہلے زمین پیدا کی گئی اور علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی دلیل قرآن مجید سے پیش کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے :۔

جعل لکم الارض فراشاً "تمہارے لیے زمین کو ہم نے فرش بنایا"

اور دوسری جگہ ہے :۔

وجعلنا السماء سقفاً محفوظا "ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا"

اور محفوظ کا مطلب یہ ہے کہ آج تک نہ اس میں کوئی خرابی پیدا ہوئی نہ کوئی خلل۔ نہ کوئی شگاف پڑا نہ کبھی مرمت کی ضرورت پیش آئی جیسا بنا دیا تھا ویسا کا ویسا ہی آج تک موجود ہے۔ یہ مطلب ہے محفوظ ہونے کا۔ غرض ان دونوں آیتوں کے ملانے سے پتہ چلتا ہے کہ آسمان کو بعد میں پیدا کیا گیا اور زمین کو پہلے بنایا۔ کیونکہ طریقۂ تعمیر یہی ہے کہ اول مکان کے نیچے کا حصّہ بنایا جاتا ہے۔ پھر چھت ڈالی جاتی ہے۔ نیچے کے حصّے کی تعمیر پہلے ہوتی ہے اور چھت بعد میں ڈالی جاتی ہے اور یہ امر خلاف عقل ہے کہ چھت پہلے بنا دی جائے اور بعد میں نیچے کا حصّہ تعمیر ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حتیٰ کہ آسمانوں سے بھی پہلے خانہ کعبہ کو بنایا گیا۔ پھر اس کی عجیب و غریب شان رکھی۔ جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ :۔

واد غیر ذی ذرع "یعنی ایسی وادی کہ جس میں کھیتی باڑی کا کہیں نام و نشان نہیں"

جس میں نہ کوئی کھیتی باڑی ہے نہ کہیں سبزہ زار ہے نہ کوئی نہر ہے نہ چشمہ ہے۔ بس ریت کے میدان ہیں اور بے آب و گیاہ پہاڑ اور جب اس پر سورج سمت الراس سے پڑتا ہے تو گرمی بھی نہایت شدّت کی پڑتی ہے۔ غرض راحت و آرام کے جملہ سامان مفقود ہیں۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے یہاں پہ وہی ٹِکے گا جس کو خدا تعالےٰ سے تعلق ہو گا۔ کوئی تفریح اور دل بستگی کی وجہ سے

وہاں نہیں رہ سکتا۔ غرض یہ شہر اس طرح بنایا کہ اس میں زمین سے بھی مشقت اور آسمان سے بھی مشقت۔ تو اس شہر کی قسم کھانا جو طرح طرح کی مشقتوں سے گھرا ہوا ہے۔ دراصل اشارہ ہے جواب قسم کی طرف کہ یہ جگہ صعوبتوں اور مشقتوں کا مرکز ہے۔ دیکھئے اسلام سے قبل آدھی دُنیا قیصر روم کے زیر نگیں تھی اور آدھی دُنیا پر کسریٰ کی حکومت تھی۔ لیکن عرب کی سرزمین کو نہ قیصر روم نے اپنا دارالحکومت بنایا اور نہ کسریٰ نے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بنجر اور غیر نفع بخش علاقہ اس قابل نہیں کہ اس پر حکومت کی جائے کیونکہ اس سے کسی قسم کی آمدنی ہی نہیں۔ نہ کھیتی باڑی نہ تجارت نہ صنعت۔

لیکن خدا تعالےٰ کی حکمت اس کو مقتضی تھی کہ اپنے نبی آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ پیدا کریں کہ جہاں کسی کی حکومت اور اقتدار نہ ہو اور اس جگہ پر اللہ تعالےٰ کی حکومت قائم ہو۔ سو الحمد للہ وہی اُونٹ چرانے والے اور بادیہ پیما لوگ جو وحشی کے نام سے دُنیا میں مشہور تھے۔ اسلام کی برکت سے اس قابل ہو گئے کہ جنہوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے اور چار دانگ عالم میں اسلام کا جھنڈا لہرا دیا۔ غرض اس شہر کی قسم کھائی جو سراپا مشقت ہے۔ آگے ہے :-

ووالد وما ولد   "یعنی قسم ہے والد کی اور اسکی اولاد کی"

والد بھی مشقت کا سرچشمہ ہے اور اولاد بھی۔ اولاد تو اس طرح کہ بچہ ماں کے پیٹ میں بچہ دانی میں بند ہے غذا اس کو اس خون سے ملتی ہے جو کہ گندا اور خراب ہوتا ہے۔ کیونکہ اطبار کا اتفاق ہے کہ ہر ماہ جو خون عورت کے جسم سے خارج ہوتا ہے وہ ایام حمل میں بند ہو جاتا ہے اور اس سے بچے کو

غذا پہنچتی ہے غرض بچہ وہاں بند ہے جو ظاہر ہے کہ مشقت کا باعث ہے۔ اور اب ولادت کا مرحلہ آیا تو بچہ پیدا ہوا۔ پیدا ہو کر بچہ روتا ہے کیونکہ اس کو روزی کی تلاش و جستجو ہوتی ہے اور یہ بھی مشقت کا باعث ہے۔ اب پستانِ مادر سے دُودھ حاصل کرتا ہے اور دو برس تک مردے کی مانند جھولے میں پڑا رہتا ہے اور بے حس و حرکت۔ کچھ دین و دُنیا کی اس کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ذرا بڑا ہوا تو مکتب میں بٹھایا گیا جہاں استاد کی سرزنش اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ اس طرح یہ زمانہ بھی مشقت اور تکلیف ہی میں گزرا۔ پھر انسان تعلیم سے فارغ ہُوا تو شادی ہو گئی۔

لوگوں کا خیال ہے کہ شادی مسرتوں اور خوشیوں اور راحتوں کا سرچشمہ ہے مگر حقیقت بین نگاہ سے اگر دیکھا جائے اور غور کیا جائے تو سراسر مشقت کا باعث ہے نہ کہ راحت و آرام۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اکیلا ہوتا ہے تو کسی نہ کسی صورت میں اپنا گزر کرتا ہی رہتا ہے۔ مگر شادی کے بعد انسان کو کما کر لانے کی بڑی بھاری فکر لاحق ہو جاتی ہے اور دن رات بس یہی فکر ہے کہ لا لا کر گھر میں دیتے رہو اور بیوی کی ناز برداریاں کرتے رہو یہ حاصل ہے شادی کا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے نکاح کی حقیقت دریافت کی کہ حضرت نکاح کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "لزوم مہر" یعنی سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مہر لازم ہو جاتا ہے۔

سائل نے سوال کیا "ثمہ ماذا" کہ پھر کیا؟

آپ نے فرمایا کہ "سرور شہر" یعنی کچھ دن کی ایک مہینہ کی خوشی۔ اُس

نے پھر سوال کیا "ثم ماذا" کہ پھر کیا ؟

آپ نے فرمایا کہ "عنوم دھر" یعنی عمر بھر کا غم ۔

اور واقعی یہ ایسا غم ہے کہ جس سے انسان کو نجات نہیں ملتی ۔ اور پرانے قسم کے لوگوں کو تو کچھ کم غم ہوتا ہے مگر آج کل کے مہذب اور متمدن حضرات کو تو بہت ہی سخت غم ہوتا ہے کہ کما کما کر سارا لاکر بیگم صاحبہ کو دے دو اور اوپر سے ناز نخرے اٹھاؤ ۔ ان کے رحم و کرم پر پڑے ہیں جو دے دیا خرچ کر لیا ورنہ خیر ۔ ان سے بڑھ کر غموم دہر کا مصداق اور کوئی نہ ہوگا ۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ شادی کر کے بنگلہ اور کار اور نوکر چاکر اور عیش و آرام ہوگا ۔ مگر آخر ان چیزوں کے لیے جن اخراجات کی ضرورت ہے وہ کہاں سے پورے ہوں گے ؟ غرض یہ کہ شادی کے بعد انسان مشقت میں گرفتار ہو جاتا ہے ۔

سائل نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پھر سوال کیا کہ حضرت اس کے بعد کیا ؟ آپ نے فرمایا کہ "کسور ظھر" یعنی کمر ٹوٹ جاتی ہے ۔

واقعی مشقتیں اور مصیبتیں جھیلتے جھیلتے انسان کی کمر ہی ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے بعد سائل نے آپ سے سوال ہی نہیں کیا ۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر وہ سوال کرتا کہ پھر کیا ؟ تو اس کا یہی جواب ہوتا کہ "نزول قبر" یعنی اس کے بعد انسان قبر میں اتر جاتا ہے تو یہ ہے انسان کی شادی اور یہ ہے اس کا انجام ۔ اور مختلف مراحل ۔ تو غرض اولاد بھی مشقت میں گرفتار ہے یہ سب قسمیں کھا کر آگے فرماتے ہیں کہ :-

لقد خلقنا الانسان فی کبد   "ہم نے یقیناً انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔"

اس جملے میں اس متکبّر و مغرور کا جواب اس طرح ہوا کہ " اے متکبّر و مغرور انسان! ذرا اپنے حال پر ایک نظر تو ڈال۔ کس منہ سے یہ متکبّرانہ الفاظ نکالتا ہے اور کیا سمجھ کر جنت و دوزخ کا انکار کرتا ہے؟ ذرا اس شہر کی طرف تو دیکھ! جس میں تو رہتا ہے کہ وہ سراپا رنج و تکلیف ہے۔ ذرا اُس کی آب و ہوا پر نظر ڈال تو تجھے معلوم ہو کہ تو کتنا عاجز و لاچار اور مجبور ہے کہ تیرے اختیار میں کچھ نہیں۔ پھر جب سے پیدا ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک مشقّت و محنت میں تیرا وقت گزرا ہے اور گزر رہا ہے اور برابر ہموم و غموم میں مبتلا ہے۔ تو جس شخص کا یہ حال ہو کہ ہر طرف سے اس کو ہموم و غموم اور مشقتیں گھیرے ہوئے ہوں اُس کو کیا حق ہے کہ اس قسم کے متکبّرانہ الفاظ کہے اور اس کو کیا حق ہے خدا کے رسول کے ساتھ تمسخر کرنے کا۔ یہ کلمات اور یہ باتیں ایسے شخص کے لیے ہرگز جائز نہیں "

یہ تو اجمالی جواب تھا۔ آگے تفصیلی جواب شروع ہوتا ہے۔ اس اجمالی جواب میں عام طور سے فرمایا کہ انسان مشقّت میں ہے۔ یعنی خواہ انفرادی طور پر دیکھ لو یا اجتماعی طور پر دیکھ لو۔ رعایا کو حکومت کا ڈر ہے اور حکومت کو رعایا کی طرف سے پریشانی ہے۔ نہ بادشاہ آرام میں ہے نہ فقیر۔ آگے فرماتے ہیں:۔

ایحسب ان لن یقدر علیہ احد "کیا اس کا گمان ہے کہ اس پر کسی کو قدرت نہیں"

یعنی یہ جو اس کافر کا خیال ہے کہ کون میرے اعمال کا حساب لے گا اور کون مجھ سے باز پرس کرے گا۔ تو کیا اس کا یہ خیال ہے کہ اس پر کسی کو قدرت نہیں ہے؟ کیا جو مشقّت اور محنت وہ جھیل رہا ہے اس کے باوجود بھی

اُس کو یہ گمان ہے ۔

ایحسب ان لم یرہ احد "کیا اُس کا گمان ہے کہ اُس کو کوئی دیکھ نہیں رہا"۔

اس کا گمان تھا کہ تم جو کہتے ہو کہ خدا تعالے تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اس لیے اس کے مطابق جزا و سزا دے گا تو میں اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ خدا دیکھ رہا ہے اس کا کیسا عجیب جواب ارشاد فرمایا :

الم نجعل لہ عینین ۔ "کیا ہم نے اُس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں ؟"

یعنی جس خدا نے تم کو آنکھیں عطا کیں جن میں اُس نے محض اپنی قدرت سے دیکھنے کی طاقت پیدا کی تو کیا جو بینائی پیدا کرتا ہے وہ خود دیکھنے سے عاجز ہو گا۔ جس نے تم کو بینائی دی وہ تم کو نہ دیکھے گا۔ اس کے بعد اس کی اس بات کا جواب ہے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا کہ جو کچھ مال میں خرچ کرتا ہوں اور مقصود اس سے شہرت وغیرہ حاصل کرنا ہوتا ہے تو خدا تعالے کو اس کا علم ہے کہ کس نے کس نیت سے مال خرچ کیا سو اس کا جواب فرمایا کہ :۔

ولسانا و شفتین "اور کیا ہم نے اس کی زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے ؟"

دیکھیے انسان کے دل میں جو خیال آتا ہے یا جو بات آتی ہے تو اس کے اظہار کا طریقہ یہی ہے کہ انسان اس کو زبان اور ہونٹوں کی مدد سے ادا کرتا ہے۔ تو گویا اظہار ما فی الضمیر کا وسیلہ زبان اور لب ہیں اس لیے فرمایا کہ جو ذات تمہارے دل کے چھپے ہوئے رازوں کے اظہار کے واسطے سامان پیدا کر سکتا ہے کیا وہ خود اُن سے بے خبر ہو گا۔ آگے فرماتے ہیں کہ :۔

وھدینٰہ النجدین ۔ "اور ہم نے اُس کو دونوں راستے بتلا دیئے ۔"

یعنی ہم نے اُس کو خیر و شر سمجھا دیا اور بتلا دیا کہ یہ راستہ خیر کا ہے اور یہ راستہ شر کا ہے ۔ پیغمبروں کو بھیجا اور اُن کے ذریعے سے یہ بتایا کہ خیر و شر یہ ہے ۔ پھر عقل عطا فرمائی تاکہ اس سے انبیاء کرام علیہم السلام کی بتائی ہوئی باتوں کو سمجھو اور قبول کرو ۔ غرض یہ کہ باہر انبیاء علیہم السلام راہ بتانے والے اور اندر عقل راہ بری کرنے والی ۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب " الاقتصاد فی الاعتقاد" میں لکھا ہے کہ عقل بذاتِ خود کسی چیز کو سمجھنے کے قابل نہیں ۔ بلکہ باہر سے جو چیز اس کے سامنے آتی ہے ۔ اس کے متعلق وہ فیصلہ کرتی ہے ۔ جیسے ڈاکٹر کسی مریض کے مرض کو تشخیص کرتا ہے تو عقل اس کو باور کر لیتی ہے کہ ڈاکٹر کا کہنا صحیح ہے ۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام انسان کو ہدایت کا راستہ بتاتے ہیں تو جس خدا نے انسان میں عقل پیدا کی کیا وہ قادر نہیں ۔

ایک دفعہ ایک کافر ایک گلی سڑی انسانی ہڈی کہیں سے لایا اور نبی کریم صلعم کے سامنے لا کر ازراہ تمسخر اس کو اُوپر کی طرف اُچھالا جس سے وہ چورا چورا ہو گئی ۔ اور کہنے لگا کہ :۔

من یحیی العظام وھی رمیم ۔ "کون زندہ کرے گا ان گلی ہوئی اور چورا چورا ہڈیاں کو ۔"

خدا تعالےٰ نے اس کا جواب دیا :۔

اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین و ضرب لنا مثلا ونسی خلقہ قال "کیا انسان نے یہ نہیں سوچا کہ ہم نے اس کو ایک گندہ قطرہ سے پیدا کیا اور آج وہ کھلا جھگڑالو ہے اور ہمارے بارے میں (تمسخر سے)

من یحیی العظام و ھی رمیم۔ | مثالیں بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بوسیدہ اور چورا چورا ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا"۔

اس جواب کا حاصل یہی ہے کہ اپنی پہلی پیدائش پہ غور کرو اور سوچو کہ ہم نے تم کو نطفہ سے پیدا کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نطفہ کیا چیز ہے۔ سو تمام اطبار اس پر متفق ہیں کہ نطفہ انسان کے تمام بدن کا خلاصہ اور اُس کا نچوڑ ہے اور نطفہ سے جب انسان کی تخلیق ہوتی ہے تو اس کی صُورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں جو سر کے اجزا ہیں ان سے سر بنتا ہے۔ جو پیر کے اجزار اس نطفہ میں آگئے ہیں اس سے بچے کا پیر بنتا ہے۔ غرض تمام اجزار سے وہی وہی جزو بنے گا۔ تو جب انسان تخلیق کی اس صورت میں غور کرے گا تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ بچے کے جملہ اجزائے بدن اس کے ماں باپ کے بدن کے جملہ اجزار میں بکھرے ہوئے تھے۔ جب خدا نے ان منتشر اجزار کو ایک نطفہ کی صُورت میں جمع کر کے اور پھر ان میں سے ہر ہر جزو کو الگ الگ کر کے اس سے الگ الگ اعضار بنا دیے تو پھر دوبارہ ان منتشر اجزار کو جمع کرنے میں کیوں اشکال ہے جب خُدا نے پہلی دفعہ جمع کر دیا تھا۔ وہ اب بھی جمع کر دے گا۔ اسی کو فرمایا:۔

قُل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم۔ | "یعنی اُس کو وہی زندہ کریگا کہ جس نے اس کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر طرح کی پیدائش کو خوب جاننے والا ہے"۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں جو قیامت کے دلائل اور صورتیں ہیں ان کا حاصل جمع اور تفریق ہے۔ یعنی پہلے انسان کے اجزار متفرق تھے ان کو جمع کر دیا۔ پھر مرنے کے بعد منتشر ہو جائیں گے پھر جمع کر دیا جائے گا اور اس کائنات میں

روزانہ اس جمع تفریق کا مشاہدہ کرتے ہو پھر بھی باور نہیں کرتے۔ غرض اس طرح
حق تعالےٰ جل شانہٗ نے اس متکبّر و مغرور کا جواب دیا۔ تکبّر اور غرور خُدا کے
نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور مردود ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے ایک
عجیب بات تکبّر اور غرور کے متعلق فرمائی ہے اور وہ یہ کہ اور تو جتنے گُناہ ہیں اُن
کی سزائیں تو دیر ہو جاتی ہے مگر تکبّر ایسا گناہ ہے کہ متکبّر کو فوراً اس کی سزا
مل جاتی ہے وہ یہ کہ متکبّر فوراً مخلوق کی نظروں سے گِر جاتا ہے اس لیے تکبّر
سے بچنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اب دُعا کرو کہ خدا تعالےٰ ہم کو تکبّر
اور غرور کی بلا سے محفوظ رکھے اور انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے راستہ پہ
ثابت قدم رکھے۔ آمین ! ثم آمین۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام
علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہٖ و
اصحابہ اجمعین ۔:۔

حضرت تھانویؒ کے سیاسی افکار

(مولانا تقی عثمانی)

اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ کو خوب نوازا تھا زندگی کے ہر گوشہ پر حضرت کی نظر تھی، آپ کی تصانیف مواعظ اور ملفوظات اس کے گواہ ہیں اس کتاب سے دلچسپ حقائق سامنے آئینگے

تاریخ فرشتہ اردو

(محمد قاسم فرشتہ)

ہندوستان کی مشہور و معروف تاریخ جو عرصۂ دراز سے نایاب تھی، دو ہزار صفحات پر مشتمل بہت جامع اور ضخیم تاریخ ہند

آدمؑ سے محمدﷺ تک

(محمد رفیع صاحب)

قرآنی آیات کے حوالوں سے تاریخی واقعات سبق آموز انداز میں سہل اور آسان زبان مسلم نوجوان نسل کیلئے ایک ضروری کتاب

سائنس اور اسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عظیم اجتماع میں کی گئی ایک معرکۃ الآرا تقریر

اسلام کے بنیادی عقائد

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی اسلامی بنیادی عقائد پر ایک اہم کتاب۔

لطائفِ علمیہ

امام ابن جوزیؒ

عقل ودانائی، ذکاوت و ذہانت، حاضر جوابی کے متعلق عجیب وغریب حکایات وواقعات کا نہایت دلچسپ اور مستند ذخیرہ۔

نزہۃ المجالس

دلچسپ واقعات وحکایات، مفید اور کارآمد لطائف قرآن وحدیث کی نادر تفاسیر نایاب طبی نسخہ جات کا انمول خزانہ

وعظ نمبر ۴

غرور و تکبّر کا علاج

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِنَا هُمْ أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝

"سو وہ شخص گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا اور تم کو کیا معلوم کہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ کسی گردن کا چھڑا دینا یا کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک میں ملے ہوئے محتاج کو پھر وہ ان لوگوں میں سے نہ ہوا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیّت کی اور ایک دوسرے کو رحم اور شفقت کی وصیّت کی۔ یہی لوگ داہنے والے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے کفر کیا وہ لوگ بائیں والے ہیں۔ اُن پر آگ ہو گی جو ان پر محیط ہو گی اور اس کو بند کر دیا جائے گا"۔

گذشتہ جمعہ میں بھی میں نے اس سورۃ کا ابتدائی حصہ تلاوت کر کے اس کے متعلق بیان کیا تھا جس میں خداوند تعالیٰ نے ایک متکبّر و مغرور متفاخر کی باتوں کا جواب دیا تھا۔ اب جو سورۃ کا باقی حصہ اس وقت مَیں نے آپ کے سامنے تلاوت کیا ہے اُس میں خُداوند تعالیٰ نصیحت فرماتے ہیں کہ اس شخص کو بجائے ان متکبّرانہ خیالات اور مغرورانہ الفاظ کے یہ یہ کام کرنے چاہئیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

فلا اقتحم العقبۃ "کیوں نہ پار ہُوا گھاٹی سے"

وما ادرٰلک ما العقبۃ "اور تجھے معلوم بھی ہے وہ گھاٹی کیا ہے؟"

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص جو کلمات متکبرانہ کہہ رہا ہے اس کو اب چاہیئے کہ گھاٹی سے گزر جائے۔ اور گھاٹی سے گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کہا یہ ہے مُشکل اور صعوبت سے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی مشکل کام کو کر گزرے تو اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ شخص گھاٹی سے گزر گیا۔ اس جگہ یہ مطلب ہے کہ خداوند تعالیٰ تک پہنچنے کا رستہ کوئی آسان اور ہنسی کھیل نہیں ہے بلکہ وہاں تک پہنچنے کے لیے کچھ مشکلات اور صعوبتیں اٹھانی پڑیں گی اور گھاٹی سے گزرنا پڑے گا۔ آگے اس گھاٹی کا ذکر ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فک رقبۃ یعنی گردن چھڑانا۔ گردن چھڑانے کے مختلف معنی مفسّرین نے بیان کیئے ہیں۔ مثلاً کسی غلام کو غلامی سے آزاد کرانا۔ دُوسرے قرض خواہ کا قرض ادا کر کے اس کی گردن چھڑانا۔ تیسرے یہ کہ کسی مظلوم کو ظالم کے ظلم سے آزاد کرانا۔ مطلب یہ ہے گھاٹی سے گزرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی غلام کو آزاد کر دیا کسی مظلوم کو ظالم کے پنجہ سے چھڑا دو۔ حاصل یہ ہُوا کہ مال و دولت پر غرور کرنے کے بجائے اس کو خدا کی راہ میں صرف کرنا چاہیئے۔ آگے فرماتے ہیں:-

او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ۔ یعنی گھاٹی سے گزرنے کا دُوسرا طریقہ اور

خُدا تک پہنچنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ کھانا کھلا دے۔ کسی بھوک والے دن میں۔ اور یہ کھانا کس کو کھلا دے؟ اس کا ذکر آگے ہے کہ:۔ یتیما ذامقربۃ او مسکینا ذامتربۃ یعنی کھانا کسی قرابت دار یتیم کو کھلائے۔ یا کسی مسکین کو جو بالکل خاک ہی میں ملا ہُوا ہو۔ اس جگہ جو مسکین کے ساتھ لفظ "ذامتربۃ" یعنی مٹی میں ملا ہُوا فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض فقراء اور مساکین تو ایسے ہیں کہ جن کا خرچ ان کی آمدنی سے زیادہ ہوتا ہے۔ سو وہ بھی ایک طرح کے مسکین ہیں اور ایک وہ ہے کہ جس کی کوئی آمدنی ہی نہیں اور اس کے پاس بجز خاک کے اور کچھ نہیں۔ اس کے حالات ایسے ہیں کہ جیسے وہ بالکل مٹی ہی میں مل گیا ہو۔ تو اس کو کھانا کھلانا اور اس کی مدد کرنا یہ زیادہ باعثِ فضیلت ہے۔ ایک مرتبہ میرا مسوری جانے کا اتفاق ہُوا۔ لوگ وہاں ایک مسجد بنوا رہے تھے۔ ہم اس مسجد میں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک پہاڑی پر نہایت شاندار بنگلہ لوگوں نے مجھے دکھایا اور بتایا کہ جن صاحب کا یہ بنگلہ ہے وہ بہت رئیس اور مالدار آدمی ہیں۔ اہل شہر نے ان سے مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ طلب کیا تو انہوں نے نہایت لاپروائی سے کہا کہ "میرے پاس اس فنڈ میں گنجائش نہیں"۔ خدا کی شان دیکھیے کہ اسی روز شدید بارش ہوئی اور ان کے بنگلہ کا وہ پُشتہ بارش کی وجہ سے گر گیا جو اس بنگلہ کو سنبھالنے کے لیے بنایا گیا تھا کیونکہ بنگلہ پہاڑی کے اوپر کنارہ ہی پر واقع تھا۔ اب وہ پُشتہ گر گیا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے گرنے کی وجہ سے کوٹھی بھی کچھ مخدوش ہو گئی ہو گی تو لوگوں نے اس کو دیکھ کر اور ان کا واقعہ بیان کر کے کہا اب تو غالباً فنڈ میں گنجائش نکل آئی ہو گی۔ مقصد اس واقعہ کے بیان کرنے کا یہ ہے کہ اگر انسان خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کسی وجہ سے عذر کرے تو ادب کو ملحوظ رکھے۔ گستاخانہ اور متکبرانہ الفاظ ہرگز زبان سے نہ نکالے

ایسے الفاظ خداوند تعالےٰ کو ناپسند ہیں۔ بعض اوقات حق تعالےٰ خود ہی اس کی سزا دیتے ہیں۔ اس لیے اس سے بہت ڈرنا چاہیئے۔ آگے ارشاد ہے: ثم کان من الذین آمنو یعنی پھر ہوتا ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے۔ اس جگہ علماء کو یہ شبہ ہُوا کہ خدا تعالےٰ نے اس جگہ "ثم" کا لفظ جس کے معنی "پھر" ہیں کیوں فرمایا؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟ سو مطلب اس کا یہ ہے کہ گھاٹی سے گزرنے کے جو کام خدا تعالےٰ نے اس جگہ ذکر فرمائے وہ کام کبھی کافر بھی کرتا ہے مگر خدا تعالےٰ کے ہاں ضابطہ یہ ہے کہ نیک اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے۔ اگر ایمان ہے تو عمل قبول ہے اور اگر کافر ہے تو رد ہے۔ تو مطلب یہ ہُوا کہ اگر تم نے یہ سب کام کئے مگر ایمان نہ لائے تو بے کار۔ اس جگہ ممکن ہے آج کل کے مہذب اور متمدن لوگ یہ اعتراض کریں کہ صاحب یہ تو کھُلی تنگ نظری ہے کہ کافر اگر نیک کام کرے تو قبول نہیں۔ حالانکہ وہ بھی خدا کے لیے کرتا ہے اور اس کی نیت بھی خالص ہوتی ہے مگر محض کفر کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا جاتا۔

سو جواب اس کا یہ ہے کہ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ ہدیہ اور نذرانہ اس شخص سے قبول کیا جاتا ہے جس سے تعلق ہو۔ اگر کوئی شخص ہدیہ دے یا نذرانہ دے جو مخالف ہے اس کا نذرانہ قبول نہیں کیا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ ہم تمہارا ہدیہ کیوں لیں۔ تمہارا ہم سے تعلق کیا؟ تو اس کو کوئی تعصب اور تنگ نظری نہیں کہتا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے بالکل ٹھیک کیا۔ غیرت اور خودداری کا یہی تقاضا ہے پس اگر خدا تعالےٰ بھی اپنے دشمن اور مخالف کا نذرانہ قبول نہ کریں تو کیوں اشکال ہے اور خدا تعالےٰ سے تعلق رکھنے کا ذریعہ ایمان ہے۔ جو شخص ایمان لے آیا اُس نے خدا تعالےٰ سے تعلق قائم کر لیا اور جو ایمان نہیں لایا وہ باغی ہے۔ تو اگر

وہ یہ شرط لگا دیں کہ اگر ایمان لاؤ گے تو قبول کریں گے ورنہ نہیں تو عین حکمت اور عین مصلحت ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس جگہ "پھر" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے قبل از اسلام یہ نیک کام کئے پھر وہ ایمان لایا تو اب اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوگا کہ آیا اس کے وہ نیک کام جو اس نے قبل از اسلام کئے اسلام لانے کی برکت سے وہ قبول ہو جائیں گے۔

حکیم بن حزام ایک صحابی ہیں جو قبل اسلام لانے کے بھی بہت سخی اور نیک آدمی تھے اسلام لانے کے بعد انھوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم سے یہی سوال کیا کہ کیا میرے وہ اعمال اور صدقات وخیرات قبول ہوئے یا رد ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: اسلمت علیٰ ما اسلفت من خیرٍ۔ یعنی وہ تمام کے تمام قبول ہو گئے۔ اس جگہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کافر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو کفر کے ساتھ ظالم اور شریر بھی ہوتے ہیں کہ لوگوں پر ظلم کرنے اور دوسری برائیاں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور پھر کافر ہی رہنے کی حالت میں مر گئے یعنی خاتمہ کفر پر ہوا۔ دوسری قسم وہ کہ نیک دل اور سخی ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں نیک اعمال مثل صدقہ وخیرات وغیرہ کے کرتے ہیں اور خاتمہ کفر پر ہوتا ہے تو ان دونوں میں آیا کوئی فرق ہے کہ نہیں۔ یعنی اس نیک کام کرنے والے کافر کو اس کے نیک کاموں کی وجہ سے کوئی فائدہ پہنچے گا یا نہیں؟

سو اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ جائیں گے تو دونوں ہی جہنّم میں اور دونوں کو عذاب بھی دائمی اور ابدی ہو گا مگر اس نیک کام کرنے والے کو عذاب ذرا ہلکا ہو گا چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے متعلق آتا ہے کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ اے چچا!

میری خواہش یہ ہے کہ آپ ایک دفعہ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ پڑھ لیتے۔ پھر میں خدا سے خُود جھگڑ لوں گا۔ آپؐ یہ فرما رہے تھے اور ابولہب اور ابو جہل بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے ابوطالب سے کہا کہ ان کے کہنے سے اپنے آباؤاجداد کے دین کو چھوڑ دو گے؟ تو اس موقعہ پر ابوطالب نے شعر پڑھے جو سیرت کی کتابوں میں منقول ہیں:

ولقد علمت بان دین محمد — من خیر ادیان البریة دینا

لولا المسبة او حذار ملامة — لوجدتنی سمحا بذالک مبینا

غرض یہ کہ انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ "مَیں عار کو نار پر ترجیح دیتا ہوں"۔ اور یہ کہہ کر انتقال کر گئے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم پر اس واقعہ سے صدمہ گزرا اور آپؐ نے فرمایا کہ اگرچہ وہ کفر پر گزر گئے۔ مگر جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے ممانعت نہ ہو گی مَیں اُن کے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔ چنانچہ آپؐ اُن کے لیے استغفار فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربٰی من بعد ما تبین لھم انھم اصحاب الجحیم۔

"نبی کے لیے اور ایمان والوں کے لیے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے واسطے مغفرت مانگیں خواہ وہ مشرکین ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں بعد اس کے کہ ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ جہنم میں جائیں گے۔"

چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ نے استغفار ترک کر دیا۔ اس کے بعد صحابہ رضوان اللہ علیہم نے سوال کیا۔ آپ کے چچا ابوطالب نے آپؐ کی اس قدر خدمت کی اور کفار کے مقابلہ میں آپ کی جو مدد کی کیا اس کی وجہ سے ان کو کوئی فائدہ

پہنچے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں میری برکت سے ان کے عذاب میں کمی ہوگی۔ اور جہنم میں سب سے کم عذاب اور سب سے ہلکا ان کو ہوگا یعنی ان کو آگ کی دو جوتیاں پہنادی گئی ہیں۔ جس سے ان کا دماغ ہنڈیا کی طرح پکتا رہے گا۔ اس مقام پر اس کی توجیہہ میں علامہ سہیلی نے سیرت ابن ہشام کی شرح میں لکھا ہے کہ دو جوتیاں پہنانے میں حکمت یہ ہے کہ چونکہ ابو طالب سرتاپا حضور صلے اللہ علیہ وسلّم کی محبّت میں غرق تھے۔ مگر قدم ملّت جاہلیّت پر قائم رہے۔ اس لیے فقط قدموں کو عذاب دیا گیا اور باقی بدن چھوڑ دیا گیا۔ اور اس جگہ ایک اور شبہ کا جواب دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ قرآن مجید میں ہے:

لا یخفف عنھم العذاب "کافروں سے عذاب ہلکا نہ کیا جائیگا"

اس سے بظاہر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو کافر نیک اعمال کرتے ہیں ان کو تو ہلکا عذاب ہوگا جیسا کہ ابھی بیان ہوا۔ اور آیت میں یہ ہے کہ کافروں سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا۔ سو سمجھنا چاہیئے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ فیصلہ ہو جانے کے بعد جس کافر کے لیے جتنا اور جیسا عذاب مقرر کر دیا جائے گا اس میں کوئی کمی یا کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ بعض کی سزا ہلکی ہوگی اور بعض کی شدید ہوگی۔ یہ نہیں ہوگا کہ کسی کو ابتدا میں شدید عذاب تجویز ہوا اور پھر بعد کو اس میں تخفیف ہو جائے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ ابولہب کا یاد آیا۔ یہ آپ کا چچا تھا جب اس نے آپؐ کی ولادتِ مبارکہ کی خبر سُنی تو اپنی ایک باندی ثوبیہ نامی کو خوشی میں آزاد کر دیا اس لیے آپ نے فرمایا کہ ہر دوشنبہ کے دن ابولہب کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ آپؐ کی ولادت باسعادت دوشنبہ ہی کو ہوئی تھی

جس کی خوشی میں اس نے یہ نیک کام کیا تھا جس کی برکت سے دوشنبہ کے دن عذاب ہلکا ہو جاتا ہے۔

علامہ زمخشری نے ایک لفظ لکھا ہے کہ قرآن مجید میں تین سورتیں ہیں جن کے شروع میں قل آیا ہے۔ یعنی خداوند تعالےٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا کہ آپ کہہ دیجئے۔ قل اعوذ برب الناس، قل اعوذ برب الفلق اور قل ھو اللہ احد۔ مگر اس کے بعد جو چوتھی سورت ہے وہ تبت یدا ہے۔ اس میں "قل" یعنی کہہ دیجئے۔ نہیں فرمایا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو وجہ اس کی یہ ہے کہ "قل" کا مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالےٰ اس بارے میں خود براہِ راست خطاب نہیں فرما رہے ہیں بلکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے خطاب فرما رہے ہیں کہ آپ یوں کہہ دیجئے۔ تو خطاب فرمانے والے اس صورت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہوئے۔ تو چونکہ تبت یدا میں ابولہب کے عذاب کا ذکر ہے اور ابولہب آپؐ کے چچا تھے تو اگر اس میں بھی "قل" فرماتے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے چچا کو عذاب کی خبر دینے والے ہوتے جو خلاف ادب تھا۔ اس لیے خدا تعالےٰ نے براہِ راست خود یہ خبر دی۔ اپنے نبی کو حکم نہیں دیا۔

اسی طرح ایک جگہ زمخشری نے لکھا ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کا قصہ سارا پڑھ جائیے کہ انہوں نے فرعون کو دعوت دی اور خدا تعالےٰ کے احکام پہنچائے اس پر فرعون نے طرح طرح کے اعتراضات کئے۔ مگر کبھی بھی آپ نے اس کو کوئی سخت کلمہ نہیں فرمایا۔ کیونکہ جس گھر میں پرورش پائی تھی اس کے لیے ایسا کرنا سوءِ ادب تھا اور انبیاء کرام علیہم السلام سراپا ادب ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافروں

کا ادب بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ مسلمانوں کا بھی ادب نہ کیا جائے۔ غرضیکہ یہ ذکر تھا گھاٹی سے پار ہونے کا۔ یہ درجہ ذاتی کمال کا ہے۔ اب آگے تکمیل کا درجہ ہے کہ "وتواصو بالصبر وتواصو بالمرحمۃ" یعنی کیوں نہ وصیّت کی صبر کی، کیوں نہ وصیّت کی شفقت و رحمت کی۔ صبر کے فضائل تو قرآن مجید اور احادیث میں بے شمار ہیں۔ مگر ان کے بیان کا وقت نہیں۔

اس وقت صبر کے معنی سمجھ لیجیئے۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالےٰ نے انسان کے اندر نفس اور نفسانی خواہشوں کا مادہ پیدا کیا اور دوسری طرف دین کے احکام پر چلنے کا حکم دیا تو جب کبھی بھی نفسانی خواہش میں اور دین کے حکم میں تصادم ہو تو اس وقت نفسانی خواہش کو پامال کر کے اور چھوڑ کے ترجیح دینا اور اس پر عمل کرنا۔ بس یہ معنی ہیں صبر کے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجیئے کہ ایک شخص نے آپ کے پاس بیس ہزار روپیہ امانت رکھوایا اور مر گیا۔ اس کے وارثوں کو بھی اس کا علم نہیں۔ اب نفس کی خواہش ہوئی کہ اس روپے کو لے لینا چاہیئے۔ کیونکہ دُنیا میں کوئی اس کا مطالبہ کرنے والا نہیں۔ اور دُوسری طرف دین کا یہ حُکم ہے کہ اس روپے کو اس کے ورثہ کے حوالے کر دو۔ اس موقعہ پر اس شخص نے اگر وہ روپیہ ورثاء کے حوالے کر دیا تو صبر کی فضیلت اس کو حاصل ہو گئی کہ نفس کے مقابلہ میں دین کو ترجیح دی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ صبر کی نعمت ایسی ہے کہ جو فرشتوں کو نہیں ملی۔ کیونکہ ان میں نفس اور نفسانی خواہشات ہی نہیں ہیں تو ان کو ایسی کشمکس بھی پیش نہیں آتی۔ اس لیے صبر کے مقامات خداوند تعالےٰ نے بنی نوع انسان کے لیے مختص فرمائے ہیں۔ آگے ہے کہ مہربانی اور شفقت کی وصیّت کرنا۔ سو

حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ مہربانی اور شفقت کیا ہے؟ سو یاد رکھو کہ اس کے معنی یہ نہیں کہ انسان اپنے بیوی بچوں سے شفقت و مہربانی کا سلوک کرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی عمر میں اس سے بڑا ہو اس کے ساتھ باپ یا چچا کا سا برتاؤ کرے۔ یعنی عزت و اکرام کے ساتھ پیش آئے۔ خواہ اس سے کوئی رشتہ داری وغیرہ ہو یا نہ ہو اور جو برابر کا ہو اس سے اپنے بھائی جیسا سلوک کرے اور چھوٹوں سے بچوں جیسا برتاؤ کرے۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ ہے کہ آپ کے پاس آپ کے ایک گورنر ملنے کے لیے آئے۔ آپ کو تلاش کیا تو مسجد میں ملے۔ دیکھا کہ بوریئے پر لیٹے ہیں اور محلّے کے بچے چاروں طرف جمع ہیں۔ کوئی پیٹ پر چڑھ رہا ہے کوئی ٹانگوں پر، کوئی دامن کو گھسیٹ رہا ہے اور کوئی سر پر چڑھ رہا ہے۔ ان کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کیونکہ یہ بڑے دبدبے اور ہیبت والے گورنر تھے۔ انہوں نے تعجب سے سوال کیا کہ اے امیر المومنین! یہ کیا حالت ہے؟ یہ بات شانِ حکومت و خلافت کے مناسب نہیں۔ اور میں تو جب دربار کرتا ہوں تو بڑے رُعب داب سے کرتا ہوں۔ کسی بچے کو تو کیا بڑے بڑے آدمیوں کی مجال نہیں ہوتی کہ دم ماریں۔ حضرت فاروق اعظمؓ سُنتے رہے اور پھر مزید تاکید کے لیے سوال کیا کہ کیا تم اسی طرح کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ جاؤ ہم نے تم کو گورنری سے معزول کیا۔ تم گورنر ہونے کے قابل نہیں۔ خُدا نے ہم کو حکومت و امارت اس لیے نہیں دی کہ ہم مسلمانوں اور ان کی اولاد کو ریاست اور حکومت دبدبہ اور ہیبت دکھائیں۔ بلکہ اس لیے دی کہ ان کے ساتھ شفقت و رحمت سے پیش آئیں نہ کہ ان کے لیے ایک مصیبت بن جائیں۔ آگے حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان کاموں کو کر گزریں:

اولئک اصحب المیمنہ   "یہی لوگ دائیں والے ہیں"۔

اس کے مفسرین نے کئی مطلب بیان کئے۔ بعض نے میمنہ کے معنی برکت والے مبارک اور نصیبے والے بیان کئے۔ بعض نے کہا کہ میمنہ کے معنی داہنے والے۔ یعنی جنت میں یہ لوگ عرش کے داہنی طرف سے داخل ہوں گے۔ بعض نے کہا کہ چونکہ مسلمانوں کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اس لیے ان کو اصحاب المیمنہ کہا گیا۔

آگے ہے:۔

والذین کفروا بایاتنا ھم   "اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا

اصحب المشئمۃ ۔   وہ لوگ نحوست والے ہیں"۔

آگے فرمایا:۔

علیھم نار مؤصدۃ   "ان پر آگ ہوگی بند کی ہوئی"۔

بند کی ہوئی کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی سوراخ کھلا ہو تو اس میں سے آگ کی حرارت نکل جاتی ہے اور فی الجملہ حرارت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس طرح باہر سے ٹھنڈک داخل ہو جاتی ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ دوزخ ان پر بند کر دی جائیگی۔ کہ نہ اس کی حرارت باہر نکل سکے اور نہ باہر سے ٹھنڈ اس میں داخل ہو سکے۔ کوئی راستہ تخفیف کا نہیں۔

اس جگہ بھی لوگوں کو یہ اشکال گذرتا ہے کہ دائمی عذاب اور وہ بھی اتنا شدید خلافِ تہذیب ہے اور عدل کے منافی ہے۔ مگر آپ دیکھیے کہ دُنیا کی حکومتیں باغیوں کو چودہ چودہ سال کے لیے قید بامشقت کی سزا دیتی ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہے کہ عمر بھر کی قید بامشقت۔ مگر اس کو کوئی خلاف عدل نہیں سمجھتا کہ آخر ایک قابل اور فاضل اور روشن دماغ انسان کو محض بغاوت کی بنار پر ہمیشہ کے لیے قید کر دیا گیا اور

اُس کی ذاتی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ حالانکہ یہاں پر دُنیا کے جو حکام ہیں اُن کی حیثیت یہ ہے کہ اس باغی کی زندگی اور حیات کے نہ وہ مالک ہیں نہ ان کی عطا کردہ ہے بلکہ محض حکمران ہونے کی وجہ سے یہ سزائیں دی جاتی ہیں مگر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ تو خدا تعالےٰ جس نے عقل و فہم جسم و جان سب کچھ عطا کیا۔ اور ہر چیز کا وہ خالق ہے تو اگر وہ اپنے باغیوں کے لیے عذاب دائمی کی سزا تجویز فرمائے تو اشکال کیوں ہے ؟

آخر میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی قوانین کی رُو سے کافر کو کوئی عہدہ نہیں دیا جاسکتا۔ اور اس سلسلہ میں تعصب اور تنگ نظری کا گمان کرنا کم فہمی کی بات ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جس طرح کوئی حکومت اپنی حکومت کے باغی کو کوئی عہدہ دینا گوارہ نہیں کرتی۔ کیونکہ جملہ کافر اسلام اور خدا اور رسول کے باغی ہیں اور تمام حکومتوں کا قاعدہ ہے کہ باغی کو کوئی عہدہ نہیں ملتا۔ اس کی سزا حبس دوام ہے۔

اب دُعا کرو کہ خدا تعالےٰ ہم کو اس طریقہ پر چلائے جو گھاٹی سے گزرنے کا اللہ تعالےٰ نے بیان فرمایا اور خدا تعالےٰ ہم کو نافرمان اور باغی نہ بنائے اور اپنی اطاعت اور فرمانبرداری پر ہمارا خاتمہ فرمائے۔ آمین !

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وعلینا معھم یا ارحم الراحمین۔

وعظ نمبر ۵

مقاصدِ بعثت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ اجمعین۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ الۡمَلِکِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۔ هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۔

"اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہیں وہ تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں وہ اللہ جو بادشاہ ہے۔ پاک ہے زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے اور ان کو اسکی آیتیں تلاوت کر کے سناتا اور انکے دلوں کے زنگ کو دور کرتا ہے اور انکو کتاب کے معانی و مطالب بتاتا ہے اور حکمت کی باتیں بتاتا ہے حالانکہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔"

یہ آیتیں جو اس وقت مَیں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں سورۃ جمعہ کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ اِن آیتوں میں اللہ تعالےٰ نے اولاً اپنی تسبیح وتنزیہ بیان کی ہے اور اس کے بعد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا بیان ہے اور آگے بعثت کے مقاصد بیان فرمائے ہیں۔ غرض ان آیتوں کی ترتیب عجیب و غریب شان کی ہے۔ مَیں ان کا ترجمہ اس طرح کروں گا کہ ساتھ ساتھ ماقبل کی آیت کا مابعد کی آیت سے ربط وتعلق بھی واضح ہوتا چلا جائے۔

"تسبیح وتنزیہ" کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالےٰ ہر عیب اور بُرائی سے پاک ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ وہ بادشاہ ہے اور ظلم سے پاک ہے "عزیز" کے معنی غالب اور "حکیم" کے معنی حکمت والا۔ اس جگہ خدا تعالےٰ نے اپنی چند صفتیں بیان فرمائی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ دُوسرے یہ کہ وہ شہنشاہ ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ ظلم سے پاک ہے۔ چوتھے یہ کہ غالب ہے یعنی عاجز نہیں اور پانچویں صفت یہ کہ وہ حکمت والا ہے۔ یہ پانچ صفات بیان فرمانے کے بعد فرمایا کہ "ھوالذی بعث...... الخ" یعنی وہ خدا جس کی صفتیں بیان ہوئیں اسی نے اَن پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے اور اَن پڑھ لوگوں سے مراد اس جگہ اہلِ مکہ ہیں یعنی اللہ تعالےٰ نے مکہ میں اپنا رسول بھیجا۔ ماقبل سے اس کا ربط یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ بادشاہ ہے اور تمام مخلوق اس کی رعایا ہے تو جس طرح ہر بادشاہ اپنی رعایا کے لیے ایک دستُور اور قانون بناتا ہے تاکہ رعایا اُس پر عمل کرکے اپنے بادشاہ کی فرمانبرداری اور اطاعت کر سکے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے جب اپنا بادشاہ ہونا بیان فرمایا اور عقلاً بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی

رعایا کے لیے قانون بنائے تو اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے ایک رسول بھیجا
جس کے ذریعے سے اپنا دستور اور قانون مخلوق تک پہنچایا تاکہ وہ اس پر عمل
کر کے خدا تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی سعادت حاصل کر سکیں۔ اور
خدا تعالیٰ نے اپنی صفت "قدوس" یعنی وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، بیان فرمائی تھی
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مخلوق کو اپنے قانون سے آگاہ نہیں کرتا
اس وقت تک سزا نہیں دیتا۔ پہلے رسول بھیج کر مخلوق کو اپنا قانون اور اپنے احکام
پہنچا دیئے پھر جو کوئی نافرمانی کرتا ہے اس کو سزا دی جاتی ہے۔

مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ "ہم عذاب کرنے والے نہیں تھے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت بیان فرمائی کہ وہ زبردست
ہے۔ یہ صفت اس لیے ذکر فرما دی کہ نافرمانیوں پر خدا تعالیٰ کی طرف سے
جو فوری پکڑ نہیں ہوتی تو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ کوئی مواخذہ کرنے والا ہی
نہیں بلکہ خدا تعالیٰ زبردست ہے جب چاہے سزا دے دے اس کی مہلت
سے نڈر اور دلیر نہیں ہو جانا چاہیئے۔ نہ پکڑنے کا منشا حلم اور بردباری
ہے نہ کہ عجز سے۔ اس کے بعد صفت حکیم ہونے کی ہے یعنی یہ مہلت دینا بھی
حکمت پر مبنی ہے۔

خدا تعالیٰ نے اپنا رسول اور پیغام رساں اُمیین میں بھیجا تاکہ اس کے
ذریعہ سے لوگوں کو آگاہ کرے۔ اس رسول کی شان یہ ہے کہ "یتلو علیھم آیاتہ
یعنی اللہ تعالیٰ کی آیتیں اُن کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور "و یزکیھم"
اپنے فیضِ صحبت سے لوگوں کے دلوں کے زنگ کو صاف اور دور کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ نبی کا پہلا کام یہ ہے کہ خُدا تعالےٰ کی طرف سے نازل شُدہ آیات کو بجنسہٖ پڑھ کر سُنا دے اور دُوسرا کام یہ ہے کہ اپنے فیضِ صحبت سے لوگوں کے دلوں کے زنگ کو دُور کرے ۔ اس کے بعد نبی کا تیسرا کام یہ ہے کہ "یعلمھم الکتب والحکمۃ" ان کو کتاب کے معنی اور اُس کا مطلب سمجھا دے اور حکمت و دانائی کی باتیں بتائے ۔ اب نبی کے چار کام معلوم ہوئے ۔ اوّل تلاوت آیات ۔ دُوسرے تزکیہ ۔ تیسرے تعلیم کتاب اور چوتھے تعلیم حکمت ۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے جو حکمت و دانائی کی باتیں اُمّت کو بتائی ہیں وہ تمام دُنیا کے حُکماء و عقلا کی بیان کردہ باتوں سے بالا و برتر اور ارفع و اعلےٰ ہیں ۔ حضرت زید بن ارقم رضؓ ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ :

مَا تَرَكْتُ مِنْ خَيْرٍ اِلَّا وَقَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَمَا تَرَكْتُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا وَقَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ ۔

"میں نے کوئی بھلائی کی بات نہیں چھوڑی جس کا تم کو امر نہ کر دیا ہو اور کوئی بُری بات ایسی نہیں چھوڑی کہ اُس سے تم کو روک نہ دیا ہو"

اس سے معلوم ہُوا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے جو دین ہم کو پہنچایا ہے اس میں تمام حکمت و دانائی کی باتیں موجود ہیں اور تمام خرابیوں اور بُرائیوں سے بچنے کی ہدایت موجود ہے ۔

اس جگہ ایک شُبہ کا جواب دے دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو حضرت مجدّد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ نے لکھا ہے اور اس کا جواب دیا ہے

شبہ یہ ہے کہ بعض ملاحدہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام کے بھیجنے کی اور شریعت کے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ خدا نے انسان کو عقل اور سمجھ دی ہے۔ انسان اس سے کام لے کر برائی سے بچ سکتا ہے اور بھلائی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ ورنہ اس عقل کا وجود بیکار ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ خدا تعالے کے احکام سمجھنے کے لیے عقل کافی ہے یہ غلط ہے۔ عقل بے چاری خدا تعالے کے احکام تو بڑی چیز ہیں اپنی ہی ضروریات کو صحیح اور کامل طریقے سے نہیں سمجھ سکتی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان میں ایک تو عقل ہے اور ایک نفس ہے تو عقل کے ساتھ نفسانی خواہشات مل جاتی ہیں اور پتہ نہیں چلتا۔ تو ہم کیسے سمجھیں گے کہ یہ تقاضا خالص عقل کا ہے اور اس میں نفس کی آمیزش نہیں ہے اس لیے حق تعالے کا بڑا احسان ہوا کہ اس نے رسول بھیج کر ہم کو اپنے احکام سے آگاہ کر دیا۔ اب ہم کو پورے یقین کے ساتھ یہ معلوم ہے کہ جو احکام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچائے ان میں ذرہ برابر نفس کا شائبہ نہیں ہو سکتا۔ اسی کو حق تعالے نے فرمایا کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا ۔	"بلاشبہ اللہ تعالے نے مومنین پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں ایک رسول بھیجا"

واقعی خدا تعالے کا بڑا احسان ہوا کہ اس نے ہر طرح کے خیر و شر سے ہمیں آگاہ کر دیا اور خیر و شر کا فیصلہ ہماری عقلوں کے حوالے نہیں کر دیا۔ اگر یہ ہماری عقلوں کے حوالے کر دیا جاتا تو دنیا میں نہ ختم ہونے والا فساد اور لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا۔ کیونکہ ہر شخص اپنی خواہشات کے مطابق خیر و شر کی تقسیم کرتا اور دوسروں سے اس کو منوانے کی کوشش کرتا اور اس طرح بوالہوسوں

اور خود غرضوں کا ایک مسلسل جھگڑا شروع ہو جاتا۔ اور دُنیا ایک تماشا بن جاتی۔
اس لیے حق تعالےٰ کا بڑا احسان ہُوا کہ اُس نے رسُول بھیج کر ہدایت فرما دی۔
ورنہ ہرگز صحیح فیصلہ خیر و شر کا نہ ہوتا اور ایک بات امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے
منقول ہے وہ یہ کہ بے شک خدا تعالےٰ نے بندوں کو عقل دی ہے مگر انسان
بھی محدود ہے اُس کی عقل بھی محدود ہے اور اس کا ادراک بھی محدود۔ اس لیے یہ
محدود عقل محدود ہی کا ادراک کر سکتی ہے اور جو چیزیں اس کے احاطہ سے
خارج ہیں اُن کا ادراک وہ کیسے کر سکتی تھی۔ مثلاً آئندہ کی باتوں کا ادراک
کیسے کرتی؟ اس لیے رسولوں کو بھیجا جنہوں نے بندوں کو ایک ایسا ضابطۂ
حیات دیا جو ہر ایک کے لیے مُفید اور ہر حالت کے موزوں ہے۔ اور آخر
میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسا ضابطۂ حیات دیا کہ جو ساری دُنیا کے لیے
اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے کافی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ حق و باطل
کا فرق معلُوم کرنے کے لیے انسان کو دو قسم کے نُور کی ضرُورت ہے۔ اِن
دونوں نور کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک مثال سمجھ لیجیئے کہ مثلاً اگر آپ کو سفید و
سیاہ میں امتیاز کرنے کی ضرورت ہے تو اس کے لیے آپ کو دو قسم کے
نُور کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ کی آنکھیں اور بینائی ٹھیک ہو۔ اور
دُوسرے یہ کہ آفتاب کی روشنی موجود ہو۔ جب یہ دونوں نُور موجُود ہوں گے
تب آپ کو سفید و سیاہ میں امتیاز ہو سکے گا۔

اگر کسی شخص کے آنکھیں تو موجود ہیں مگر اندھیری رات ہے تو وہ خاک بھی
نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح اگر آفتاب اپنی پُوری آب و تاب سے روشن ہے مگر

کسی کی آنکھیں ہی نہیں، اندھا ہے تو وہ بھی کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح عقل کو بمنزلہ آنکھ کے سمجھو اور وحی الٰہی اور شریعت و دین کو جو خدا تعالےٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو دے کر بھیجا اُس کو بمنزلہ آفتاب کے سمجھو۔ پس اگر اندر عقل میں نور ہے اور باہر سے آفتاب شریعت کی روشنی ہے تو انسان کامل ہدایت یافتہ ہے اور اگر کوئی شخص دل کا اندھا ہے تو اُس کو شریعت کی روشنی سے کوئی فائدہ نہیں۔

خدا تعالےٰ نے دل کی آنکھیں عطا کیں اور باہر سے آفتاب نبوت عطا کیا تاکہ جب دونوں نور مل کر انسان کی رہبری کریں گے تب اس کو حق و باطل کا فرق نظر آئے گا۔ اس جگہ ایک اور نکتہ خیال آیا کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمِ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ "میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں، ان میں سے جس کے پیچھے لگ جاؤ گے ہدایت پا جاؤ گے۔"

یہ حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے جیسا کہ حافظ ابن عبد البر نے جامع العلم میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث کو سامنے رکھ کر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اگر آفتاب نہ ہو یعنی دن کا وقت نہ ہو تو راستہ معلوم کرنے کے لیے ستاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کو جو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے تو اس کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس دُنیا میں تشریف فرما تھے تو آپ کی ذات بابرکات تمام ہدایتوں کا سرچشمہ تھی اور آپ کے تشریف لے جانے

کے بعد صحابہؓ ہدایت کا ذریعہ ہیں ۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے عقل کے بارے میں ایک اور بات فرمائی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عقل کافی ہے ، یہ غلط ہے ۔ کیونکہ عقل جو ہے وہ نابالغ ہے اس لیے اس کا فیصلہ حجت بالغہ نہیں ۔ حجۃ بالغہ انبیاء کرام علیہم السّلام کی بعثت ہے ۔ کیونکہ عقل بالغ جبھی ہو سکتی ہے جبکہ وہ خواہشات نفسانیہ سے پاک ہو اور ایسی عقل بجز انبیاء علیہم السلام کے اور کسی کی نہیں ۔ اسی کو مولانا رومؒ نے مثنوی میں فرمایا :

؎ خلق اطفالند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

سو ہماری عقل چونکہ نفسانی خواہشوں میں ملوث ہے اس لیے نابالغ ہے اور نابالغ کا قول و فعل حجت نہیں ہوتا ۔

اب جب یہ سب باتیں سمجھ میں آگئیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ جو لوگ احادیث کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت ہے تو پھر خدا نے یہ عقل کیوں دی ہے ؟ سو اس کا جواب ظاہر ہے کہ اگر آپ موجودہ حکومت کے قانون کے بارے میں یہ کہیں کہ اس قانون کا مطلب جو وزراء اور ارکان دولت یا عدالتوں کے جج و کلاء بیان کرتے ہیں ہم اس کو قبول نہیں کرتے اور ہم کو ان کی تشریحات کی ضرورت نہیں ہے جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں بلکہ ہم کو خدا تعالےٰ نے عقل دی ہے ہم اس کے ذریعے سے اس قانون کو اور اس کے مطلب اور مقصد کو خود سمجھ کر عمل کرلیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کو کان پکڑ کر جیل میں بھیج دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ قانون کا وہی مطلب

آپ کو ماننا پڑے گا جو وزرار اور ججوں نے بیان کیا ہے کیونکہ آپ کی عقل لولی اور لنگڑی ہے ۔ اس لیے آپ کا سمجھا ہوا مطلب حجت نہیں۔

بس اسی طرح قرآن مجید کا وہی مطلب اور تشریح قابل قبول ہوگا جو خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا یا جن لوگوں نے آپ کی صحبت اٹھائی یا جن لوگوں کے قلوب کو حق تعالےٰ نے نور علم اور نور فہم اور نور تقوےٰ سے منوّر فرمایا ۔ ہر بوالہوس کا بیان کیا ہوا مطلب قابل قبول نہیں۔ اس آیت میں یعلمہم الکتٰب کے یہی معنی ہیں کہ آپ قرآن مجید کا جو مطلب بیان فرمائیں وہی معتبر ہے اور اگر کوئی کہے کہ نبی کا بتایا ہوا مطلب تو معتبر نہیں بلکہ میرا بتایا ہوا مطلب معتبر ہے تو اس کے اس قول کی وقعت دیوانوں اور مجنونوں کی بڑ سے زیادہ نہیں ۔

جیسے کہ ایک ایسا شخص جو انگریزی نہ جانتا ہو بلکہ انگریزی کی شُد بُد بھی نہ رکھتا ہو وہ جا کر ہائی کورٹ کے کسی جج سے بحث کرنے لگے کہ صاحب آپ نے جو فلاں قانون کا یہ مطلب بتایا ہے یہ غلط ہے بلکہ اس کا صحیح مطلب مَیں بیان کرتا ہوں آپ کو چاہیئے کہ آپ بھی اس میرے بتائے ہوئے مطلب کو تسلیم کرلیں اور اپنے بتائے ہوئے مطلب سے رجوع کرلیں۔ تو ہائی کورٹ کا جج اس کو دیوانہ کہے گا اور پاگل خانے میں بھیجنے کا حکم دیگا۔ بلکہ اگر کوئی شخص انگریزی بھی جانتا ہو مگر اس نے قانون کا فن نہ پڑھا ہو تو اس کو بھی اس قسم کی تشریح کا حق نہیں پہنچتا ۔ ہاں جو شخص باقاعدہ قانون پڑھ کر کوئی بات قانون کے بارے میں کہے تو وہ سُنی جائے گی اور اس پر غور کیا جائے گا ۔ بس اسی طرح جو لوگ عربی زبان سے مطلق ناآشنا

ہیں اور وُہ قرآن فہمی کا دعوے کریں اُن کے دیوانہ ہونے میں شک نہیں۔ اُن کو چاہیئے کہ پہلے عربی زبان پر عبور حاصل کریں۔ پھر فنِ تفسیر پڑھیں پھر ان کو جو کچھ کہنا ہے کہیں۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کا سمجھنا اور علوم دینیہ کسی مولوی کی میراث اور جاگیر نہیں۔ جیسے قانون کسی کی میراث نہیں مگر اس کا پڑھنا اور اس فن کو باقاعدہ حاصل کرنا تو شرط ہے۔ یہ تو نہیں کہ محض ترجمہ دیکھ کر الٹ پلٹ رائے دینی شروع کر دی اور اس سلسلہ میں اُن لوگوں سے تو شکایت ہے ہی جو اس قسم کی دخل اندازی اور رائے زنی دین کی باتوں میں کرتے ہیں اور نت نئے فتنے پھیلاتے رہتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ سخت افسوس اور بہت زیادہ شکایت اُن لوگوں سے ہے کہ جو بے سمجھے سوچے ان کی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔

غضب کی بات ہے اور اندھیر ہے کہ قرآن پاک کا جو مطلب اُس ذات با برکات نے بیان کیا ہے جس پر وہ نازل ہوُا وہ غلط اور اُن کی صُحبت اُٹھانے والوں نے جو سمجھا وہ بھی غلط ہے اور جو مطلب اُس کا عربی زبان کے ماہروں نے بتایا وہ بھی غلط اور جو مطلب یہ لوگ سمجھے جو عربی کی ابجد سے بھی ناواقف اور فن تفسیر و حدیث سے بھی بے بہرہ وہ معتبر۔ یہ تو وہی بات ہوُئی کہ ؎

دیوانہ گُفت و ابلہ باور کرد

یعنی دیوانے نے کہی اور پگلے نے مان لی۔ اور اب تو ان لوگوں کی جرأت اور گستاخی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ یوُں کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم بمنزلہ ڈاکیہ کے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں

آپ کا کام صرف یہ ہے کہ قرآن کریم کو بندوں تک پہنچا دیا۔ اب بندے اس کو خود سمجھیں اور عمل کریں۔ آپ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ نبی کا مرتبہ ہرگز ہرگز ڈاکئے کا نہیں بلکہ نبی کا مرتبہ سفیر اور وزیر کا سا ہے۔ جیسا کہ خدا تعالےٰ نے فرمایا کہ :

انی جاعل فی الارض خلیفہ "میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بناؤں گا"

اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو نبی ہیں اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کر کے بھیجا نہ کہ ڈاکیہ اور ہرکارہ۔

اور جو لوگ اس قسم کے گستاخانہ کلمات زبان سے نکالتے ہیں اُن سے یہ سوال کیا جائے کہ آپ کا کون سا اتنا بڑا مرتبہ اور مقام خدا تعالےٰ کے ہاں ہے کہ خدا تعالےٰ آپ کو خط لکھیں گے اور اس خط کے بھیجنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو نعوذ باللہ ڈاکیہ بنائیں گے۔ خدا تعالےٰ کے یہاں تو آپ کا کیا مقام اور مرتبہ ہوتا۔ آپ کو تو صدر مملکت بلکہ ڈپٹی کمشنر بھی کوئی خط نہیں لکھتا۔ بلکہ پولیس کا ایک جوان آپ کے نام وارنٹ لے کر آجاتا ہے۔

غرض نہ معلوم ان لوگوں کو اپنے متعلق کیا گمان ہے اور کس بنا پر گمان ہے کہ خدا تعالےٰ سے ان کی خط و کتابت ہے۔ ان لوگوں کا گمان ہے کہ یہ تو خدا تعالےٰ کے برگزیدہ اور مقبول و مقرب بندے ہیں اور نعوذ باللہ! نعوذ باللہ انبیاء کرام ان سے کم درجہ رکھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے ان کے نام خط لکھ کر ڈاکئے کے ذریعے بھیج دیا۔ کیا یہ خدا اور رسول کی سخت توہین نہیں!

کلام اُن پر اُترا ۔ جبرائیل ان کے پاس آئے ۔ ان کا سینہ آفتاب کی طرح روشن ہے ۔ اگر تم نے ان کا اتباع کیا تو نجات ورنہ خُدا کے غضب کے مستحق اور اس قسم کے گستاخانہ کلمات قابل استغفار اور قابل لاحول ہیں ۔ ان سے توبہ کرنا چاہیئے ۔

اب دُعا کیجئے کہ حق تعالےٰ ہم کو توفیق دے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کا مقام سمجھیں اور ان تمام فتنوں سے خدا تعالےٰ ہم کو بچائے جو آج کل پھیل رہے ہیں ۔ خدا تعالےٰ ہم سب کو ایمان پر قائم رکھے اور ایمان ہی پر خاتمہ نصیب فرمائے ۔ آمین !

واخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالےٰ علی خیر خلقہٖ سیّدنا ومولانا محمد وعلی الہٖ واصحابہٖ اجمعین ٥

۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ نمبر ۶

عصمتِ انبیا علیہم السلام

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور
انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ
ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ
ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ وبارک وسلم تسلیماً
کثیراً کثیراً۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا
غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ
يُّوْحٰى عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى
وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ
قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ
مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝
اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً
اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ
الْمَاْوٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۔ مَا
زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۔

"قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے یہ تمہارا ساتھی نہ
راہ سے بھٹکا اور نہ غلط راستہ ہو لیا اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی
سے باتیں بناتا ہے انکا ارشاد نری وحی ہے جو اُن پر بھیجی جاتی
ہے انکو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے۔ پیدائشی قوت
والا ہے پھر وہ فرشتہ اپنی اصلی صورت پر نمودار ہوا۔ ایسی حالت
میں کہ وہ بلند کنارہ پر تھا پھر وہ نزدیک آیا اور نزدیک آیا
جو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم پھر اللہ تعالیٰ
نے اپنے بندہ پر وحی نازل کی جو کچھ نازل کی تھی کوئی غلطی نہیں
کی۔ قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں۔ تو کیا تم اُن سے انکی دیکھی
ہوئی چیز میں نزاع کرتے ہو اور انہوں نے اس فرشتہ کو

ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اسکے قریب جنت الماویٰ ہے جس وقت کہ ڈھانک رہی تھی اس سدرۃ المنتہیٰ کو وہ چیز جو کہ ڈھانک رہی تھی، نگاہ نہ ہٹی اور نہ بڑھی"۔

گذشتہ سال اسی جلسہ کے موقع پر میں نے عصمت انبیا علیہم السلام کا مضمون بیان کیا تھا۔ اس وقت جو آیتیں میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں اس سے بھی میرا مقصود عصمت انبیاء ہی کا بیان کرنا ہے۔ یہ آیتیں سورۂ نجم کی ابتدائی آیتیں ہیں جو میرے مضمون کے لحاظ سے تو مناسب ہیں ہی ویسے بھی باعتبار نظم قرآنی کے مشکل ہیں اور تفسیر کے لحاظ سے مشکلاتِ قرآن میں سے ہیں۔ آج سے کئی سال قبل بھی میں نے ان آیتوں سے حجیت حدیث کا مضمون بیان کیا تھا اور اسی سے آج انشاء اللہ عصمت انبیاء کا مضمون بیان کرنے کا ارادہ ہے تاکہ گذشتہ سال کے مضمون کا تکملہ اور تتمہ ہو جائے۔ پہلے ان آیات کا ترجمہ بیان کر دوں۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى "قسم ہے ستارے کی جب وہ اوپر سے نیچے کی طرف اترنے"۔

"ہویٰ" کے دو معنی ہیں اوپر سے نیچے آنا اور نیچے سے اوپر چڑھنا دونوں معنے آتے ہیں اور بعض صحابہ سے اسکا ترجمہ اس طرح منقول ہے کہ قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہو جائے اور اسی معنی کو ترجیح ہے۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ ویسے بھی ہر زبان میں یہی ہے کہ ہر قسم کے بعد جواب قسم ضرور ہوتا ہے یعنی قسم کھا کر جو بات کہی جاتی ہے وہ جواب قسم کہلاتی ہے۔ اسجگہ جواب قسم اگلی آیات ہیں۔ یعنی:-

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى "تمہارے ساتھی گمراہ نہیں ہوئے نہ یہ بے راہ ہوئے"۔

اس جگہ صاحبکم سے مراد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور صاحبکم فرما کر دراصل مشرکین مکہ پر حق تعالیٰ نے تازیانہ مارا ہے کہ جو شخص ہر وقت اور ہر لحظہ تمہارے ساتھ ہے اور تم ہر وقت اسکو دیکھتے ہو اور اسکی ہر ہر حالت اور ہر نقل و حرکت سے باخبر ہو۔ پھر اس کے

بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہو۔ کبھی اسکو دیوانہ اور مجنوں کہتے ہو اور کبھی اُسکو بے راہ اور گمراہ گردانتے ہو حالانکہ اُس کی ہر بات حکمت و دانائی سے پُر ہے اور اس کا ہر فعل اور ہر نقل و حرکت عقل و فہم پر مبنی ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۔

"کوئی بات اپنی زبان سے نفسانی خواہش سے نہیں نکالتے۔ نہیں ہے انکا تعلق مگر وحی ہے جو بھیجی جارہی ہے اسکو تعلیم دی گئی ایسے فرشتے نے جسکی قوتیں حد کمال کو پہنچی ہوئی ہیں۔"

مراد اس سے جبریل ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ان کی ہر قسم کی قوت اعلیٰ درجے کی ہے۔ قوتِ علم۔ قوت عقل۔ قوت حافظہ وغیرہ۔

ذُو مِرَّةٍ "بڑے حسن و جمال والے ہیں" فَاسْتَوَىٰ "سیدھے کھڑے ہو گئے نبی کے سامنے"

اسکا مطلب سمجھنے کے لیے یہ سمجھ لیجئے کہ تمام انبیاء کرامؑ پر جو وحی الٰہی نازل ہوتی رہی وہ جبریلؑ ہی کی وساطت سے نازل ہوئی تھی مگر انکے پاس حضرت جبریلؑ ہمیشہ آدمی کی صورت میں تشریف لاتے تھے مگر نبی کریمؐ نے جبریلؑ کو دو دفعہ اُن کی اپنی اصلی شکل میں دیکھا ہے ایک دفعہ تو ابتدائی زمانہ بعثت میں جب آپؐ غارِ حرا میں تشریف رکھتے تھے اور "اقرأ" کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئے کچھ عرصہ گزرا تھا اور اسکے بعد وحی آنا بند ہو گیا تھا۔ جسکی وجہ سے آپؐ کو بیحد رنج تھا اور آپؐ پر یہ وحی کا بند ہو جانا حد درجہ شاق تھا۔ حضرات! خدا جانے اللہ کے نبی پر اُس وقت کیا گزری ہو گی۔ صحیح بخاری میں اس کا ذکر ہے کہ آپ اس درجہ پریشان ہوئے کہ ایک دفعہ پہاڑ پر اس نیت سے چڑھ گئے کہ پہاڑ سے اپنے کو گرا دیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اسی وقت حضرت جبریلؑ ظاہر ہوئے اور آپؐ کو تسلی دی اور اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ :۔

ے بر دلِ سالک ہزاراں غم بود | گر زباغ دل خلالے کم بود
ہجر سے بڑھکر مصیبت کچھ نہیں | اس سے بہتر ہے کہ مرجاؤں کہیں

یعنی اگر دل کے چمن میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے تو سالک پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تو حضرت حبیب سالک کو اس قدر غم ہوتا ہے تو نبی کے غم اور قلق کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ روح المعانی میں حضرت انس بن مالک رضؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلِ الْمَلَائِکَةِ ” کیا میں تم کو نہ بتادوں کہ ملائکہ میں سب سے افضل کون سا فرشتہ ہے “

صحابہ نے عرض کیا کہ بلیٰ یا رسول اللہ ! کہ کیوں نہیں ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ جبریلؑ۔ غرض حضرت جبریلؑ اپنی شکل میں ظاہر ہوئے جنکی تمام ظاہری اور باطنی حافظہ وغیرہ کی قوتیں حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنٰى ۔ ” اور وہ فرشتہ اس وقت افق اعلیٰ پر تھا پھر وہ نبی کریمؐ کے قریب ہو گئے “

احادیث میں آتا ہے کہ جب آپؐ نے جبریلؑ کو انکی اصلی صورت میں دیکھا تو آپ بیہوش ہو گئے اور اسجگہ پر یہ شبہ نہ کرنا چاہیئے کہ جب آپؐ فرشتوں سے افضل ہیں تو آپؐ بیہوش کیوں ہو گئے ؟ کیونکہ نبی کریمؐ کا مزاج روحانی تو بلا شبہ ملائکہ سے بالاتر تھا مگر بشری مزاج میں اتنی قوت نہیں اسلئے بیہوش ہو گئے۔ غرض اب جبریل علیہ السلام قریب ہوئے۔

فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۔ ” اور قریب ہوئے اور اتنے قریب ہوئے کہ دو کمان کے برابر فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم۔ پھر اللہ کا پیغام پہنچایا آپؐ کو “

یہ ان آیات کا اجمالی ذکر ہے ان آیات میں ایک تو ذکر ہے حضرت جبریلؑ کے
اوصاف کا اور ماضلّ صاحبکم وماغوىٰ اور ماینطق عن الھویٰ الخ۔ میں ذکر ہے
نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کا۔

اس مقام پر سب سے اوّل محل اشکال یہ بات ہے کہ خدا تعالےٰ نے اس جگہ ایک
مخلوق یعنی ستارے کی قسم کھائی ہے اور اس کے علاوہ اور بھی کئی جگہ قرآن مجید میں
مخلوقات کی قسم کھائی گئی ہے مثلاً یٰسٓ، والقراٰن الحکیم۔ اِنّکَ لمن المرسلین۔
اس جگہ قرآن مجید کی قسم کھا کر آپ کی رسالت کو بیان کیا گیا ہے اور سورہ صٰفٰت میں فرشتوں
کی قسم کھا کر اپنی وحدانیت کو ذکر کیا ہے اور سورۂ والذاریات اور والمرسلات میں
فرشتوں کی قسم کھا کر قیامت کو ذکر کیا ہے اور اس جگہ خدا تعالیٰ نے ستارے کی
قسم کھائی ہے اور قسم کھا کر مشرکین کی اس بات کی تردید کی ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ یہ دیوانہ
ہو گیا ہے تو یہ بات نہیں ہے نہ یہ دیوانہ ہوُا نہ یہ بے راہ ہے بلکہ ٹھیک راہ پر
جا رہا ہے۔ دُوسرا اشکال اسجگہ یہ ہے کہ قسم اور جواب قسم میں کیا ربط ہے؟ سو امام
رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس کی تحقیق فرمائی اور فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں قسم سے تین
باتیں مقصود ہوتی ہیں۔ یا تو یہ کہ قسم کھا کر جو بات کہی جا رہی ہے وہ سچّی ہے۔ کیونکہ
عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ قسم کھا کر کوئی بات کہتے تو جھوٹ نہ بولتے تھے۔ کفار
مشرکین سے نبی کریمؐ کی نبوّت کے انکار کرنیکے لیے دلائل و براہین کا کوئی جواب نہ بن پڑتا
تھا اسلئے کہتے تھے کہ یہ تو دیوانہ ہو گیا اور اپنے دین کو چھوڑ کر گمراہ ہو گیا ہے اسلئے حق تعالےٰ
اُنکی اس بات کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہم قسم کھا کر تم سے کہتے ہیں کہ یہ نہ دیوانہ ہوئے ہیں
نہ بے راہ ہوئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قسم سے کبھی محض تاکید مقصود ہوتی ہے۔ تیسری
بات امام رازیؒ نے یہ فرمائی کہ ایک وجہ قسم کھانے کی یہ [illegible]تی ہے کہ جس [illegible] تعالےٰ

قسم کھاتے ہیں وہ دلیل ہوتی ہے جوابِ قسم کے لیے ۔ مثلاً یٰسٓ والقرآن الحکیم" میں
قسم تو قرآن مجید کی کھائی ہے اور جوابِ قسم میں فرمایا کہ انک لمن المرسلین یعنی آپ رسول
ہیں تو آپ کی رسالت کی دلیل قرآن مجید ہے جو خدا تعالےٰ کا قانون ہے اور دستور ہے
اور آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل ہے ۔

اب یہاں اسکو منطبق کیجیے کہ اس جگہ جو خدا تعالیٰ نے ستارے کی قسم کھائی ہے کہ "قسم
ہے ستارے کی جب وہ غروب ہو جائے" یہ کسطرح دلیل بنے گی مابعد کے لیے ۔ سو خدا
نے قرآن مجید میں کواکب اور نجوم کا ذکر فرمایا ۔ ایک جگہ ذکر فرمایا :-

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ "لوگ ستاروں سے راہ پاتے ہیں"۔

عرب کا طریقہ تھا کہ وہ دریا میں کشتیوں کا سفر کرتے تھے اور رات کے وقت
جب راستہ نظر نہیں آتا تو ستاروں کو دیکھ دیکھ کر راستہ معلوم کرتے تھے اسی شمس و
قمر کے متعلق حق تعالےٰ نے فرمایا کہ :-

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا "اور سورج چلتا ہے اپنے مستقر پر"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر ستارہ کے لیے خدا تعالےٰ نے ایک مدار کو مقرر کر دیا
ہے جو اسکے مطابق چلتا ہے ۔ کسی ستارے کی یہ مجال نہیں کہ اپنے مدار اور محور کے
سوا کسی دوسری طرف کو گردش کرے ۔ تمام کواکب کے لیے حرکت کیفیت اوقات
وغیرہ مقرر کر دیئے ہیں جن میں کسی قسم کی تبدیلی ناممکن ہے ۔ کوئی نہ اپنے دائرے
سے ہٹ سکتا ہے نہ وقت سے مقدم و مؤخر ہو سکتا ہے ۔ جب سے یہ عالم پیدا
ہوا یہ نظام جاری ہے تو جس طرح ہم نے آسمان پر ایک ستارہ بنا دیا ہے اسی طرح
ایک ستارہ یہ ہے کہ جو ہم نے زمین پر بھیجا ہے جو نبوت و رسالت کا ستارہ ہے
جیسے آسمان کا ستارہ اپنے مدار پہ جا رہا ہے اسی طرح یہ زمین کا ستارہ بھی اسی راہ

پر چلتا ہے جو ہم نے اس کو بتا دی اور اس کے لیے مقرر کر دی جیسے تم آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر راستہ معلوم کرتے ہو اسی طرح اس نجم نبوت دہدایت سے ہدایت و راہبری حاصل کرو۔ وہاں دنیا کا راستہ معلوم کرتے ہو اس سے آخرت کا راستہ معلوم کرو۔

اس جگہ ایک اور اشکال ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالےٰ نے صرف ستارے کی قسم کیوں نہ کھائی " اذا ھویٰ " یعنی جب وہ غروب ہو جائے یا اوپر سے نیچے کو آئے اس قید کے ساتھ کیوں مقید فرمایا۔ یعنی اذا ھویٰ کے ساتھ کیوں مقید کیا۔ سو بعض مفسرین نے تو یہ فرمایا کہ اس میں نبی کریمؐ کے معراج اور آسمانوں پر جانے اور اترنے کا ذکر ہے اور " ھویٰ " کا لفظ ذو معنیین ہے کہ اسکے معنی نیچے سے اوپر جانیکے بھی ہیں اور اوپر سے نیچے اُترنیکے بھی ہیں تو نبی کریمؐ ہدایت کے ستارے تھے جب چاہا اللہ تعالیٰ اُن کو اوپر لے گئے اور جب چاہا نیچے لے آئے۔ چنانچہ آگے آتا ہے کہ :۔

وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی ۔ "اور بیشک دیکھا ہے جبریل کو آپنے دوبارہ تو یہ آپنے معراج کی شب میں نزول کے وقت دیکھا"

اور بعض مفسرین نے اس کی وجہ یہ لکھی کہ حضرت ابراہیمؑ اور نبی کریمؐ کی فطرت اور طبیعت میں غایت درجہ میں مناسبت ہے جیسا کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے :۔

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ وَھٰذَا النَّبِیُّ ۔ "حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ قریب وہ لوگ تھے جن لوگوں نے انکا اتباع کیا تھا اور یہ نبی ہیں"

تو جب حضرت ابراہیمؑ کو مبعوث کیا گیا تو انکی قوم میں دو قسم کے اور دو عقیدوں کے لوگ تھے ایک بت پرست اور دوسرے کواکب پرست۔ ایک گروہ تو بتوں کو اپنا معبود بنائے ہوئے تھا اور اُن کی پوجا کرتا تھا اور دوسرا گروہ کواکب و نجوم کی پرستش کرتا تھا اور تمام تغیراتِ عالم کو انہی کی گردش کا نتیجہ سمجھتا تھا جیسا کہ آجکل بھی نجومیوں کا

یہی اعتقاد ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے مشرکین کا رد فرمایا، پھر کواکب پرستوں کا رد فرمایا۔ چنانچہ اپنی قوم کو سمجھانے کے لیے آپ نے ایک دفعہ کواکب اور نجوم اور چاند اور سورج کے بارے میں بطور فرض یہ کہا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے:

فلمّا رأی کوکباً قال ھٰذا ربی "جب انہوں نے ستارہ کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے۔"

یعنی انہوں نے اپنی قوم کو ستارہ دکھا کر کہا بطور فرض محال قوم کو سمجھانے کیلئے یہ کہا کہ اچھا جیسا کہ تم اس ستارہ کو ہر بات میں مؤثر سمجھتے ہو اور اسکو اپنا معبود بنائے ہوئے ہو میں فرض کئے لیتا ہوں کہ یہی میرا رب ہے مگر جب وہ ستارہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ:-

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ "میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اسی طرح آپ نے چاند اور سورج کے بارہ میں بھی فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ جب سورج نکلتا ہے تو اُس کا اور رنگ ہوتا ہے یعنی اُس میں روشنی اور چمک زیادہ ہوتی ہے اور جب غروب ہونے لگتا ہے تو اور طرح ہوتا ہے کہ اس کی روشنی مضمحل ہو جاتی ہے تو اسمیں یہ تغیرات ہوتے ہیں اور جس میں تغیرات ہوں وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ نیز یہ کہ ان کواکب پرستوں کا عقیدہ یہ تھا کہ جب ستارہ طلوع ہوتا ہے تو اُس کی تاثیر قوی ہوتی ہے اور جب غروب ہونے لگے تو اسکی تاثیر کمزور ہو جاتی ہے تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو بتلایا کہ جب تمہارے ہی عقیدہ کے مطابق اسکی تاثیر میں ضعف اور تغیر آگیا تو تم نے اسکو کیسے رب بنا لیا؟ خدا کی قدرت اور صفت میں ضعف اور کمزوری نہیں آسکتی۔ ایک معنے بعض اولیاء نے اسکے اور لکھے ہیں۔ جو بیضاوی کے حواشی میں نظر سے گزرے اور بیضاوی بھی اسجگہ کچھ اشارے کر گئے ہیں کہ "بوجہ احتجاب کے اس کو محبوب نہیں رکھتا۔" اسکے معنی یہ سمجھ میں آئے کہ جب سورج غروب ہو گیا تو اسکے نور میں وہ پھیلاؤ نہیں رہا۔ معلوم ہوا کہ اس پر بندشیں عائد ہیں

اور جس پر بندشیں عائد ہوسکیں وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

بعض عارفین نے ایک اور توجیہ کی ہے کہ جب آفتاب غروب ہو گیا تو وہ حجاب اور پردے میں چلا گیا اور جو پردے میں چلا گیا وہ محجوب ہو گیا اور جو محجوب ہو گیا وہ مقہور ہو گیا اور جو مقہور ہو گیا وہ مغلوب ہو گیا اور جو مغلوب ہو گیا وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ۔

تو چونکہ مکہ معظمہ میں جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی بُت پرست اور کواکب پرست دونوں قسم کے لوگ تھے تو اس جگہ "ہوئ" سے مراد وہی ہے جو "لا احب الافلین" میں مُراد ہے کہ بتوں کی طرح یہ ستارے بھی قابل پرستش نہیں اس لیے کہ جو چیز اُوپر سے نیچے گرے وہ خدا نہیں۔ پس لفظ "اذا ہوئ" میں کواکب پرستوں کے رد کی طرف اشارہ ہے اور ایک اور بھی اشارہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے :-

انا زینا السماء الدنیا بزینۃ	"ہم نے آسمانِ دُنیا کو ستاروں کی سجاوٹ
الکواکب وحفظاً من کل	سے مزین کیا اور کواکب کو ہر شیطانِ مردود
شیطانٍ ماردٍ -	سے حفاظت کا ذریعہ بنایا"

اس جگہ ستاروں کے دو کام ذکر فرمائے گئے ایک آسمان کی زینت اور دُوسرے شیاطین سے حفاظت۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے جو امور انتظامیہ فرشتوں کے سپرد کئے جاتے ہیں تو بادلوں میں فرشتے انکا مکالمہ اور مذاکرہ کرتے ہیں تو دُنیا کیطرف سے کچھ شیاطین آسمان کی طرف جاکر کان لگاتے ہیں کہ فرشتوں کی ان باتوں کو سُن لیں۔ ان کو دفع کرنے کے لیے ستاروں سے ان پر شعلے پھینکے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ وہاں سے بھاگتے ہیں۔ اگر اتفاقیہ کسی نے کوئی تھوڑی بہت آدھی تہائی بات

سُن لی تو وہ اس میں حاشیہ آرائی کر کے کاہنوں تک پہنچاتے ہیں تو اس جگہ ستارہ کی قسم کھانے سے یہ مطلب ہُوا کہ نبی پر جو وحی آرہی ہے وہ ہر طرح محفوظ ہے کسی کی مجال نہیں کہ اس میں کوئی خلل انداز ہو سکے۔ اب ستارے کی قسم کھانے کے تین فائدے معلوم ہُوئے۔ ایک اشارہ ہُوا حالتِ نزول کی طرف۔ کیونکہ اگر ستارہ بیچ آسمان کے ہو تب اس سے راستہ معلوم نہیں ہوتا جب تک وہ اِدھر اُدھر کو حرکت نہ کرے۔ اسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کی ہر ہر حرکات و سکنات ہدایت کا باعث ہیں۔ دُوسرا فائدہ کواکب پرستوں کا رد۔ تیسرا یہ کہ یہ معلوم ہوگیا کہ وحی الٰہی محفوظ آرہی ہے اور پہروں میں اور حفاظتوں میں اس کو بھیجا جارہا ہے۔

فانہ یسلک من بین یدیہ و من خلفہ رصداً — "پس بیشک اللہ تعالےٰ اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ دستے بھیج دیتا ہے۔ یعنی ہر طرف پہرے قائم کر دیئے ہیں۔

یہاں تک قسم کی تفصیل ہُوئی آگے جواب قسم ہے:

ما ضل صاحبکم وما غوٰی — "تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہُوا نہ بے راہ ہُوا"۔

ضل، ضلال اور غوی غوایت۔ سے مشتق ہے اب ضلالت اور غوایت میں فرق سمجھ لیجیئے۔ ضلال کہتے ہیں علم میں غلطی کو۔ یعنی اگر کسی کا علم غلط ہے تو اس کو ضال کہا جائیگا اور غوایت نیت اور عمل میں جو غلطی ہو اُس کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کریمؐ کا نہ علم غلط ہے اور نہ نیت اور عمل۔ علم بھی اعلےٰ درجہ کا صحیح اور نیت و عمل بھی صحیح آگے تیسرا لفظ ہے۔

ما ینطق عن الھوٰی — "خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا"۔

اسجگہ آپ کا کلام اور نطق مراد ہے یعنی آپ کے دہن مبارک سے جو کچھ

بھی نکلتا ہے اس میں ذرہ برابر ہوائے نفسانی کا شائبہ نہیں ہوتا۔

اس جگہ اللہ تعالےٰ نے "عن الهویٰ" فرمایا ہے۔ تین احتمال ہو سکتے ہیں کہ بالہویٰ فرماتے یا من الہویٰ فرماتے اور یا جیسا کہ فرمایا ہے عن الہویٰ۔ اوّل کا مطلب تو یہ ہوتا کہ ہوائے نفسانی کا تلفظ نہیں فرماتے۔ اس صورت میں بظاہر یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ ہوائے نفسانی کا وجود تو ہے مگر تلفظ نہیں فرماتے اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوتے کہ آپ کے کلام کا مبداء اور منشاء ہوائے نفس نہیں ہوتا اور موجودہ صورت میں جبکہ "عن" کا استعمال ہوا ہے تو عن مجاوزت کے لیے آتا ہے جیسے "مررت عن یمینه یا مررت عن شماله" یعنی میں اس کے دائیں یا بائیں جانب سے ہو کر گزرا۔ تو اس جگہ مطلب یہ ہوگا کہ آپ کے کلام کا خواہش نفسانی کی طرف سے گزر بھی نہیں ہوا۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حق بات کہے خواہ وہ کسی نفسانی خواہش سے کہے تو وہ بھی قابلِ قبول ہوتی ہے کیونکہ حق ہے مگر آپ کی شان یہ ہے کہ کوئی حق بات بھی ایسی نہیں فرماتے جس کا نفسانی خواہش سے گزر بھی ہوا ہو۔ کیونکہ اس جگہ مفعول بہ مقدر ہے اور وہ "بالحق" ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ہوا ہے کہ فی نفسہٖ ایک لطیف اور عمدہ چیز ہے۔ لیکن اگر گلاب کے پھولوں کے پاس سے ہو کر آئیگی تو معطر ہو گی اور اگر کسی گندگی کے ڈھیر اور تعفن کی کوڑی کی طرف سے ہو کر آئے گی تو اس میں تعفن اور بدبو پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح حق بات کہ اپنی ذات میں عمدہ ہے مگر نفسانی خواہش سے گزر کر آئے تو احتمال ہے کہ اس میں کوئی عفونت اور کدورت مل جائے جس کا احساس اور ادراک کسی لطیف المزاج (یعنی ولی و عارف) ہی کو ہو سکتا ہے۔ آگے ہے :-

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی "وہ اللہ کی وحی ہے جو نازل ہو رہی ہے۔"

یعنی نبی کی زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے وہ یوں سمجھو کہ اللہ ہی فرما رہے ہیں

"وحی" کہتے ہیں اللہ کے کلام کو جو نبی پر اُترے - یعنی دیکھنے میں تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ نبی بول رہا ہے مگر در حقیقت وہ ہمارا پیغام ہے جو نبی کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ مولانا رُوم فرماتے ہیں ؎

گفتۂ اوگفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے جو سورۂ نمل میں ذکر ہُوا ہے۔ جب وہ اپنی اہلیہ کو لے کر چلے ہیں تو وہ حاملہ تھیں اور راستہ ہی میں جب کہ اندھیری رات تھی اور سردی کا موسم تھا ان کو ولادت کی تکلیف شروع ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ کسی جگہ آگ کی تلاش میں نکلے دیکھا تو آگ نظر آئی اسکی طرف روانہ ہوئے اور جب وہاں پہنچے تو آواز سنائی دی:

اَنْ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۔　　"آگ کے اندر جو ذات ہے وہ بابرکت ہے اور اس کے گرداگرد جو ہیں وہ بھی بابرکت ہیں (یعنی فرشتے)"

وہب بن منبہ سے روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخت میں سے آواز آتی سُنی تو اس کی آواز کی شان یہ تھی کہ ہر طرف سے سُنائی دے رہی تھی اور بولنے والا کوئی دکھائی نہ دیتا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بولنے والا کون ہے؟ کہ مَیں اسکی آواز آگے سے بھی سُن رہا ہوں پیچھے سے بھی سُن رہا ہوں اور دائیں اور بائیں اور اُوپر سے اور ہر طرف سے سُن رہا ہوں - جواب آیا -

اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ　　"مَیں اللہ ہوں، جو زبردست اور حکیم ہے"

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے فرمایا کہ یہ کوئی درخت تھوڑا ہی بول رہا تھا بلکہ در پردہ حق تعالےٰ کلام فرما رہے تھے جیسے ٹیلیفون سے آواز آتی ہے تو ٹیلیفون نہیں بولتا بلکہ بولنے والا کوئی اور ہوتا ہے جو ٹیلیفون لیے کھڑا ہے اسی طرح نبی جو

ہے وُہ خدا کا ٹیلیفون ہے اسکے مُنہ سے جو بات نکل رہی ہے وُہ خدا ہی کی بات ہے تم ہمارے احکام کی تعمیل کرو نبی کے حلقوم کیطرف نہ دیکھو۔ کیونکہ کہنے والا نبی نہیں ہے بلکہ ہم ہیں۔

غزوۂ بدر میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میدان میں کھڑے تھے۔ سامنے مشرکین کا لشکر ہے آپ نے ایک مٹھی بھر کنکریاں اُن کی طرف پھینک دیں جو تمام لشکر کی آنکھوں میں جا گریں اور سب اپنی آنکھیں ملنے لگے۔ اسی کو فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۔ "وہ جب آپ نے کنکریاں پھینکیں تو آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ ہی نے پھینکیں۔"

اور بعض نے اس کے معنے کئے کہ آپ نے تیر نہیں چلایا بلکہ اللہ نے تیر چلایا شیخ محی الدین بن عربیؒ نے یہی معنی اختیار کئے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تیر چلتا ہے تو دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ تیر کمان سے نکل کر آرہا ہے حالانکہ تیر چلانیوالا در اصل وہ ہے جو کمان کے پیچھے کھڑا ہے اور پوشیدہ ہے اسی طرح نبی کریمؐ کی زبان سے جو بات نکل رہی ہے وہ در اصل خدا تعالےٰ کیطرف سے ہے۔ دیکھنے والا سمجھ رہا ہے کہ آپ فرما رہے ہیں مگر کہنے والا حقیقت میں کوئی اور ہے اور وہ خدا ذوالجلال ہے۔

اس جگہ تیر چلانے پر ایک فائدہ آخرت کی یاددہانی کے لیے یاد آیا۔ وہ یہ کہ موسے علیہ السلام ایک دفعہ وعظ فرما رہے تھے اور آپنے فرمایا کہ یہ آسمان تو کمان ہے اور حوادث تیر ہیں اور تیر کا چلانیوالا خدا ہے۔ کسی نے سوال کیا کہ اے کلیم اللہ! اگر یہ صورت ہے تو پھر اس سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ آپنے فرمایا کہ بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ کمان جسکے ہاتھ میں ہے اسکے برابر جا کر کھڑا ہو جائے یعنی اللہ تعالےٰ کی اطاعت قبول کر کے اسکی رحمت و عنایت میں اپنے کو داخل کر دے تو وہ آسمان سے بھی بلند ہو جائیگا۔ غرض مطلب یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ نبی بول رہا ہے بلکہ ہم بول رہے ہیں۔ اب اسکے آگے جبریلؑ کا اور ان کی صفات

مذکور ہیں کہ جن کے واسطے سے وحی نازل ہوتی ہے۔

عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی۔ "اسکو ایک بڑی قوت اور طاقت والے فرشتے نے سکھایا ہے"۔

اس جگہ اشکال یہ ہے کہ اس کا ماقبل سے کیا ربط ہے؟ مُلا مخدوم مہائمی نامی ایک عالم ہندوستان میں گزرے ہیں جن کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو علم لدنی حاصل تھا اور وہ حضرت خضر کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ایک مختصر تفسیر بھی لکھی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ یہ جملہ "ماینطق عن الھوی" کی دلیل ہے۔ یعنی جب اس کو تعلیم دینے والا اس قدر قوی اور طاقتور ہے تو پھر وہاں شیطان کی کیا مجال ہے کہ وہاں دخل اندازی کر سکے۔ کیونکہ شیطان ملائکہ سے بہت گھبراتا ہے چنانچہ جنگ بدر کا واقعہ ہے کہ شیطان ابوجہل کے پاس اس کے دوست سراقہ کی شکل میں آیا اور کہا کہ میں تمہاری مدد کے لیے ایک لشکر لے کر آیا ہوں تم فکر نہ کرو۔ یہی باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا اور ابوجہل بھی ساتھ تھا۔ جب مقابلہ ہوا اور دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو شیطان نے دیکھا کہ مسلمانوں کے لشکر میں حضرت جبریلؑ تشریف لائے ہیں اور سامنے موجود ہیں۔ یہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگا اور ابوجہل سے ہاتھ چھڑا کر بھاگنے لگا۔ ابوجہل نے اُس کو روکنا چاہا اور تعجب کیا کہ یہ سراقہ کیوں اس طرح بدحواس ہو کر بھاگا جاتا ہے۔ اُس نے کہا کہ ٹھہرو تو سہی مگر وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ ہی گیا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے:۔

واذ زین لھم الشیطان اعمالھم وقال لا	"اور جب شیطان نے انکے عمل کو ان کیواسطے زینت دی اور
غالب لکم الیوم من الناس وانی جارٌ لکم	کہا کہ نہیں غالب تم پر آجکے دن کوئی لوگوں میں اور بیشک میں
فلما ترا ءت الفئتن نکص علی عقبیہ	تمہارا حاتی ہوں۔ پھر جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو
وقال انی بریٓءٌ منکم۔	اُلٹے پاؤں بھاگا اور یہ کہا کہ تحقیق میں بیزار ہوں تم سے"

اور یہ کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگا اور اسکے جواب میں شیطان نے کہا کہ:۔

انی ادعٰ مالا ترون انی اخاف — "میں دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ میں خدا سے
اللہ واللہ شدید العقاب۔ — ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

اس جگہ شیطان نے ایک بات تو سچی کہی کہ "انی اری مالا ترون" اور اگلی بات جھوٹ کہدی کہ "انی اخاف اللہ" جھوٹے کے یہ معنی نہیں کہ اسکی ساری ہی باتیں جھوٹ ہوں بلکہ اگر کوئی شخص دس باتیں بھی سچ کہے اور ایک جھوٹ کہے تو وہ جھوٹا ہی کہلائے گا۔ اسکے آگے جبریل علیہ السلام کی دوسری صفت مذکور ہے:

"ذُوْمِرَّۃٍ" یعنی نہایت حسین وجمیل ہیں۔ جنات میں تو ظلمتیں ہیں مگر ملائکہ کو اتنی نورانیت عطا ہوئی ہے کہ وہ سراپا نور ہیں وہاں نفس اور شیطان کا کہاں گزر؟ اور نحویوں کا قاعدہ ہے کہ جب جملہ ثانیہ ماقبل کی دلیل واقع ہو رہا ہو تو اس جگہ عطف جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اس جگہ "عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی" کو بغیر عطف ہی کے ذکر کیا گیا ہے اسلئے کہ جملہ پہلے جملہ کی دلیل ہے۔ آگے بیان ہے کہ نبی کریمؐ نے جبریلؑ کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا اور حضورؐ کے دل نے غلطی نہیں کی اس چیز کے ادراک کرنے میں جو دیکھا اس کے بعد ارشاد ہے:۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی — "نظر نے نہ کجی کی اور نہ عدول کیا۔"

بادشاہوں کے دربار کا اور وہاں کی حاضری کا ادب یہ ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کے دیکھنے کی اجازت ہوتی ہے اور بعض چیزوں کے دیکھنے کی ممانعت ہوتی ہے تو مطلب یہ ہے کہ وہاں پر آپکی نگاہ نے ذرہ برابر کجی اور عدول نہیں کیا جن جن چیزوں کے دیکھنے کی اجازت تھی انہی کو دیکھا اور جہاں تک نظر ڈالنے کی اجازت تھی وہیں تک نظر پہنچی۔ نہ آگے بڑھی نہ پیچھے ہٹی۔ ایسا نہیں ہوا کہ جن چیزوں کو دیکھنے کو کہا ہو ان میں سے کسی چیز کو نہ دیکھا ہو یا جن چیزوں کے دیکھنے کی ممانعت کی گئی ہو ان میں سے کسی کو دیکھا ہو۔ خلاصہ

کلام یہ کہ ان آیات میں پانچ چیزوں کی عصمت کا بیان ہُوا۔

(۱) ما ضل صاحبکم سے علم میں عصمت کا پتہ چلا کہ آپ کا علم ایسا ہے کہ اس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں اور (۲) ما غوٰی میں علم اور نیّت کی عصمت معلوم ہوئی کہ آپکا عمل اور نیّت بھی بالکل صحیح ہیں اور ما ینطق عن الھوٰی میں نطق اور گویائی اور کلام کی عصمت ثابت ہوئی کہ آپ کا کلام خدا ہی کا کلام ہے۔ اسی طرح قلب[۴] کے ادراک میں بھی کوئی غلطی نہیں۔ ماکذب الفواد میں ادراک قلب کی عصمت کا بیان ہے اور نگاہ[۵] اور بینائی میں بھی کسی قسم کی غلطی کا کوئی احتمال نہیں ماذاغ البصر و ما طغیٰ اسی عصمت بصر کا بیان ہے الحاصل نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا علم بھی معصوم عن الخطاء ہے اور آپ کی نیت اور عمل بھی معصوم عن الخطاء ہے اور آپ کا نطق اور کلام بھی معصوم عن الخطاء ہے۔ اور آپ کا ادراک قلبی بھی اور احساس بصری بھی معصوم عن الخطاء ہے۔ لہٰذا ایسی ذات بابرکات کے اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کے حجت ہونے میں کوئی دیوانہ ہی تردد کر سکتا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ نے دو مرتبہ اپنی صُورت میں دیکھا ایک تو ابتداء بعثت میں جبکہ آپ وحی کے منقطع ہو جانے سے حد درجہ مغموم تھے اور دُوسرے صدرۃ المنتہیٰ کے قریب جہاں جنت الماویٰ ہے۔ اسلئے آپ حضرت جبریلؑ کو خُوب اچھی طرح پہچانتے ہیں کوئی مغالطہ نہیں ہو سکتا اور یہ اس لیے فرمادیا کہ شیاطین کاہنوں کے پاس واہی تباہی خبریں لے کر آتے تھے اور آپ اس سے ہر طرح پاک اور معصوم ہیں۔ آپ کے پاس جو وحی آتی ہے وہ فرشتہ لے کر آتا ہے۔ معاذ اللہ کاہنوں کی طرح کوئی شیطان آپ کے پاس نہیں آتا اور آپ جبریل امین کو خُوب جانتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام آپ کے پاس خواہ کسی صُورت میں آئیں تو آپ پہچان لیں گے۔

؎ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

حضرت فرید الدین عطارؒ کے منطق الطیر میں اشعار ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ آپ کے خادم بن گئے کیونکہ آپ کی وفات سے قبل ایک دفعہ حضرت دحیہ کلبیؓ (جو آپ کے جاں نثار خادم اور صحابی ہیں) کی صورت میں حاضر ہوئے اور ایک دفعہ صحابہ کو تعلیم دینے کے لیے آپ سے احسان وغیرہ کے متعلق چند سوالات کرنے کے لیے ایک اجنبی مسافر کی صورت میں تشریف لائے جس کا ذکر بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے اس میں یہ اشکال ہے کہ اس وقت آپ سے جب اُن کے چلے جانے کے بعد صحابہؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون تھے؟ تو آپ نے تھوڑے سے تامل کے بعد فرمایا کہ یہ جبریل تھے تو آپ کے تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کو پہچانا نہ تھا بلکہ کچھ دیر کے بعد پہچانا۔ سو اس کا جواب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے دیا ہے کہ جب حضرت جبریلؑ آپ کے پاس وحی اور پیغام الٰہی لے کر آتے تھے تو آپ فوراً بلا تاخیر پہچان لیتے تھے مگر اس وقت وہ چونکہ وحی لے کر نہ آئے تھے بلکہ دین کا خلاصہ بتانے کے لیے ایک غیر معروف سائل کی صورت میں نمودار ہوئے اس لیے تھوڑی دیر کچھ اشتباہ ہو گیا اور پھر فوراً ہی تنبہ ہو گیا۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس جگہ جو حق تعالےٰ نے نبی کریمؐ اور حضرت جبریلؑ دونوں کے اوصاف کا ذکر فرمایا اس سے کیا مقصود ہے؟ تو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ تعدیل ہے سندِ وحی کی۔ کیونکہ ہمارے تک جو وحی خدا تعالےٰ کی طرف سے پہنچی ہے اس میں دو واسطے ہیں۔ ایک نبی کریمؐ اور دوسرے جبریلؑ۔ یعنی سند اس طرح ہے کہ حدثنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال حدثنا جبریلؑ قال حدثنا اللہ عزّوجل۔ اس لیے ان دونوں راویوں کی جو ہمارے اور خدا

کے درمیان واسطہ ہیں صفات بیان فرما دیں اور یہ اسناد شرط بخاری پر ہے۔ اوّل تو
راویوں کا حال معلوم ہونا ضروری ہے۔ دُوسرے یہ بھی شرط ہے کہ مروی عنہٗ سے
راوی کا لقاء بھی ثابت ہو اس لیے یہ بھی فرما دیا کہ آپ نے جبریل کو دو دفعہ دیکھا ہے
ان آیات میں راوی کا مروی عنہ سے بالمشافہ لقاء کو بیان فرمایا۔ اب روایت علی
شرط البخاری ہو گئی اور شیخ الہند فرماتے تھے کہ ہم کو وحی تین واسطوں سے پہنچی ہے۔
ایک صحابہ دُوسرے نبی کریمؐ۔ تیسرے جبریلؑ۔ اگر ان میں سے کسی ایک واسطہ پر بھی
کلام کرو گے تو دین ختم۔ اس لیے صحابہ کو بھی ماننا پڑے گا۔ اب "مَا كَذَبَ
الْفُؤَادُ مَا رَاٰى" (کوئی غلطی نہیں کی قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں) کے معنی
بھی سمجھ لیجیے!

جمہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے مُراد حضرت جبریلؑ کا
دیکھنا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے شب معراج
میں اللہ کا دیکھنا مراد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو تجلیات الٰہی نظر نے دیکھیں ان کو قلب نے غلط
نہیں سمجھا بلکہ قلب بھی اس کی تصدیق کرتا گیا اور رویت بصر اور رویت قلب میں کوئی
اختلاف واقع نہیں ہوا۔

علامہ زرقانی کا قول ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے "ما کذب الفؤاد ما رایٰ" کے
معنی یہ بیان کئے کہ فؤاد کے معنی دل اور رائی کے معنی سر کی آنکھ سے دیکھنے کے ہیں۔
یعنی انسان کی ایک آنکھ تو سر میں ہے اور ایک آنکھ دل میں ہے اور ان دونوں کے
ابصار میں اور دیکھنے میں فرق ہے۔ یعنی آنکھ کا دیکھنا اور طرح کا ہوتا ہے اور
دل کا دیکھنا اور طرح کا ہوتا ہے لیکن شب معراج میں جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
دیکھا تو آپؐ کی دونوں ابصار کی قوتیں ایک قسم کی بنا دی گئی تھیں۔ اب آیت کے معنی

یہ ہوئے کہ آپ کی دونوں قوتوں میں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ وہ بمنزلہ قوت واحدہ کے ہو گئی تھیں۔ اسی کو عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں فرمایا:

فجعل نور بصری فی فوادی — "میری آنکھ کا نور میرے دل میں ڈال دیا گیا۔"

اور اس طرح آپ نے جو کچھ دیکھا اور سُنا دل نے اُس کی پوری پوری تائید کی کسی بزرگ کا شعر ہے ؎

کلام سرمدی بے نقل بشنید — خداوند جہاں را بے جہت دید

اور بے جہت کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالےٰ تو کسی جہت میں نہ تھے مگر نبی کریمؐ جہت میں تھے۔ امام غزالیؒ نے فرمایا کہ یہ تو ثابت ہے کہ حق تعالیٰ ہم کو دیکھ رہا ہے حالانکہ وہ بے جہت ہے اور ہم سب جہت میں ہیں۔ اسی طرح اس کا عکس بھی ممکن ہے کہ ہم حق تعالےٰ کو دیکھیں کہ ہم تو جہت میں ہوں اور وہ جہت سے پاک اور منزہ ہو۔ اگلا شعر یہ ہے ؎

دراں دیدن کہ حیرت حاصلش بود — دلش در چشم و چشمش در دلش بود

اب آخری آیت کے متعلق بیان رہ گیا۔ ہمت نہیں رہی پھر کبھی انشاء اللہ موقع ہوا تو عرض کروں گا۔ دُعا کرو کہ خدا تعالےٰ ہمارا خاتمہ اپنی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت پر فرمائے اور اسی پر حشر ہو۔ آمین! یارب العالمین۔

ہماری چند اہم مطبوعات

حضرت تھانوی کے سیاسی افکار
مولانا تقی عثمانی

حضرت تھانوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کے مجدد تھے ۔ معاشرے کی ہر خوبی اور خرابی پر حضرت رحمۃ اللہ کی ہمہ وقت نظر رہتی تھی اور ہر وقت اصلاح فرماتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ مولانا تقی عثمانی کی عمر میں برکت عطا فرمائے کہ موصوف نے حضرت تھانوی کی شخصیت کو اس پہلو سے بھی روشناس کرایا ۔ حضرت تھانوی جیسی عظیم شخصیت اور مولانا تقی عثمانی کی تحریر اندازہ کیجئے کتاب کتنی اہم ہوگی ۔ معیاری ایڈیشن ۔ قیمت ۲۵/۰۰ روپے ۔

کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت

افراط و تفریط کے اس دور میں اگر ایک طرف بے لگام مغربی تہذیب نے پوری زندگی کو کھیل کود اور لہو لعب بنایا ہے تو دوسری طرف بعض دیندار حلقوں نے اپنے طرز عمل سے اس تصور کو فروغ دیا ہے کہ اسلام صرف عبادات اور خوف و خشیت کا نام ہے ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اپنے آپ کو خوش و خرم رکھنے کیلئے آپ کو ایک نئی راہ ملے گی ۔ کتابت و طباعت معیاری قیمت ۲۰/۰۰ روپے ۔

سفینۃ الاولیاء اردو

اورنگزیب عالمگیر کے بڑے بھائی دارا شکوہ کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر اپنے وقت تک اولیاء اللہ کے جامع حالات زندگی سنہ وار درج کئے گئے ۔ قیمت ۸۰/۰۰ روپے

سائنس اور اسلام

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب ؒ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عظیم اجتماع میں کی گئی ایک معرکۃ الآراء تقریر ۔ قیمت ۔ ۱۰/- روپے

آدمؑ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک

قرآنی آیات کے حوالے سے تاریخی واقعات سبق آموز انداز میں سہل اور آسان زبان میں مسلم نوجوان نسل کیلئے ایک ضروری کتاب قیمت ۔ ۲۲/-

اسلام کے بنیادی عقائد

علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ بنیادی عقائد پر ایک اہم کتاب ۔
قیمت ۱۵/۰۰ روپے

وعظ نمبر ۷

عقل کی فضیلت اور اس کی حقیقت

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ۔ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ اجمعین ط اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ ۔

"بے شک اس میں البتہ نصیحت ہے اس شخص کے لیے جس کا دل ہو یا وہ کان لگا کر سنے اور وہ دل سے حاضر ہو یعنی متوجہ ہو۔"

اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں اللہ تعالےٰ نے قلب بول کر عقل مراد لیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نصیحت ہے اس شخص کے لیے جس میں عقل ہو اور اس عقل سے کام لے کر اس کو توجہ سے سُنے اور غور کرے تو چونکہ اس جگہ عقل کا ذکر ہے اس لیے میرا ارادہ یہ ہے کہ عقل کی حقیقت اور فضیلت وغیرہ کچھ بیان کروں ۔ سو عقل کی فضیلت تو مسلّم ہے اور

ایسی مسلّم ہے کہ کسی بے عقل کو بھی اس میں کلام اور اختلاف نہیں۔ ظاہر ہے کہ ساری دُنیا کا کارخانہ ہی عقل پر چل رہا ہے۔ تجارت کو دیکھئے تو اس میں عقل کی ضرورت ہے اور صنعت وحرفت کا جائزہ لیجئے تو اس میں بھی عقل ہی کی بدولت کام چل رہا ہے اور زراعت اور کھیتی باڑی بھی عقل سے ہوتی ہے اور علیٰ ہذا آخرت کا کارخانہ بھی عقل ہی سے چلتا ہے۔

ایک حدیث میں واقعہ آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کسی جہاد سے لوٹے، کسی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا جو لوگ جہاد میں شریک ہوئے اُن کا مرتبہ برابر ہے یا کچھ تفاوت ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ باعتبار عقل کے تفاوت ہے۔ یعنی جن لوگوں کی عقل زیادہ ہے اُن کی فضیلت بھی زیادہ ہے اور جن کی عقل کم ہے ان کا مرتبہ بھی کم ہے اجر باعتبار عقل کے ملے گا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل عقل کے تابع ہُوا کرتا ہے اور اجر تابع عمل کے ہوتا ہے تو گویا اجر تابع عقل کے ہُوا۔ ایک اور روایت ہے اور اگرچہ یہ روایت ضعیف ہے مگر چُونکہ متعدد طرق سے مروی ہے اس لیے حسن کے درجہ میں آجائیگی۔ روایت یہ ہے:-

قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم اوّل ما خلق اللہ العقل فقال له اقبِل فاقبلَ ثمّ قال له ادبِر فادبَرَ ثمّ قال وعزتی وجلالی ما خلقت خلقاً اعز منکَ بکَ اٰخذ وبکَ اُعطی قال العراقی رویٰ ھذا من حدیث ابے

"نبی کریم صلے اللہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا اور اس سے خطاب فرما کر کہا کہ "اقبل" یعنی سامنے منہ کرکے کھڑی ہو۔ وہ سامنے ہوتی پھر فرمایا کہ "ادبر" یعنے پیٹھ پھیر لے۔ اس نے پیٹھ پھیرلی۔ پھر خدا تعالےٰ نے فرمایا کہ

اماصدؓ وعائشۃ وابی ھریرۃ وابن عباس والحسن وعدۃ من الصحابۃ۔ کذا فی الاتحاف۔ ص ۴۵۳ ج ۱۔

میرے عزت و جلال کی قسم ہے میں نے تجھ سے زیادہ باعزت کوئی مخلوق پیدا نہیں کی۔ تیری ہی وجہ سے لوگوں سے میں پوچھ گچھ کرونگا

اور تیری ہی وجہ سے لوگوں کو عطا اور بخشش دوں گا "

غرض نیک کام کرنے والوں کو ثواب اور اجر بھی عقل کی وجہ سے ملتا ہے اور گناہوں کی سزا بھی اسی عقل کی وجہ سے ملتی ہے۔ بے عقلوں سے کوئی بازپرس نہ ہوگی۔

شیخ نجم الدینؒ نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ اس جگہ ایک تکوینی اور تقدیری مسئلہ کا بیان کرنا ہے۔ قیامت کے روز انسان بھی دو گروہ ہوں گے۔ ایک اصحاب الیمین کا اور ایک اصحاب الشمال کا۔ جن لوگوں کے اعمال صالح ہوں گے اُن کے نامۂ اعمال اُن کو داہنی طرف سے دیئے جائیں گے۔ اس لیے اُن کا لقب "اصحاب الیمین" ہوگا۔ اور جو لوگ نافرمان ہوں گے اُن کے نامۂ اعمال بائیں جانب سے دیئے جائیں گے اور وہ "اصحاب الشمال" کہلائیں گے۔ دراصل قضاء وقدر میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ کچھ لوگ نافرمان ہوں گے اور کچھ فرمانبردار ہوں گے اور یہ فرمانبرداری اور نافرمانی عقل کی وجہ سے ہوگی اس لیے ان دونوں قسموں کو ظاہر کرنے کے لیے یہ ماجرا بنایا گیا کہ کچھ عقلیں خدا کی طرف بڑھیں گی، کچھ دوڑ کر، جو "السابقون السابقون" میں داخل ہوں گی۔ سابقین کو سابقین اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں اور کچھ آہستہ رفتار سے خدا کی طرف بڑھیں گے وہ اصحاب الیمین ہوں گے اور کچھ خدا کی طرف سے پشت پھیر لیں گے۔ وہ

اصحاب الشمال ہوں گے ۔ اور حدیث میں جو الفاظ ہیں وہ "اقبل" اور "ادبر" ہیں۔
اس لفظ اقبال اور لفظ ادبار میں اشارہ ہے کہ جو عقل ہماری طرف متوجہ ہو
گی وہ صاحب اقبال ہو گی ۔ اور جو ہماری طرف سے منہ پھیر لے گی وہ
صاحب ادبار ہو گی ۔

نوشیروان نے اپنے وزیر برزجمہر سے پوچھا کہ دنیا میں انسان کے لیے
سب سے نافع اور سود مند کیا چیز ہے ؟ کہا کہ عقل ! اس نے کہا کہ کسی کے
پاس اگر عقل نہ ہو تو کیا کرے ؟ کہا کہ پھر اس کے احباب اور بھائی برادری
ایسی ہو کہ جو اس کی پردہ پوشی کرے اور اس کی بے عقلی کو چھپائے ۔ اس نے
کہا کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو کیا کرے ؟ کہا کہ فمالٌ یتحبّبُ بہٖ الی النّاس ۔ یعنی
پھر اس کے پاس مال ہو کہ وہ اس کی وجہ سے داد و دہش کرے اور لوگوں
میں محبوب ہو ۔ کیونکہ لوگ مالدار اور سخی انسان کی پردہ پوشی کرتے ہیں ۔ چنانچہ
لوگ کہا کرتے ہیں کہ روپیہ پیسہ اور مال و دولت آدمی کے لیے ستارالعیوب ہے ۔
نوشیروان نے سوال کیا کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو کیا کرے ؟ تو اس نے کہا کہ پھر اس
کے لیے سکوت بہتر ہے ۔ یعنی خاموش رہا کرے تاکہ لوگ اس کی برائیوں اور
عیوب سے واقف نہ ہوں ۔ اس نے کہا کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو کیا کرے ؟ کہا
کہ پھر ایسے شخص کے لیے مرنا بہتر ہے ۔ واقعی بے عقلی کے بولنے سے
تو مرنا بہتر ہے ۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ عقل کی فضیلت اور برتری تمام
کائنات میں مسلّم ہے ۔ چنانچہ اس عقل ہی کی بدولت تمام چیزیں انسان کے
تصرف میں ہیں ۔ ایک ذرا سے ڈنڈے سے چرواہے گلہ کو آگے کر لیتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ گائے بھینسیں وغیرہ نہ انسان کی جسامت اور ڈیل ڈول سے ڈر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود اس سے کہیں زیادہ جسیم ہیں۔ اور نہ اُن کو اس کے گز بھر کے ڈنڈے کا خوف ہے۔ کیونکہ بڑے بڑے درخت وغیرہ اُن کے سامنے ہوتے ہیں مگر وہ کبھی کسی سے نہیں ڈرتے۔ معلوم ہُوا کہ وہ انسان کی عقل سے ڈرتے ہیں۔ اور اسی لیے اس کے مطیع ہیں۔ جیسے کوئی بادشاہ ہو اور اپنے غلاموں سے پردے میں بیٹھا ہو کہ وہ اس کو نہ دیکھ رہے ہوں مگر بادشاہ ان کو دیکھ رہا ہو۔ اب اگرچہ بادشاہ اُن کے سامنے نہیں مگر کبھی کبھی تصوّر اس کا بندھ جاتا ہے اور اس کا رعب اور ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عقل ہے کہ دکھائی نہیں دیتی مگر اس کا تصرّف سب پر چل رہا ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ عقل منبع ہے علوم اور ادراکات کا۔ منبع کے معنی سرچشمہ کے ہیں یعنی جس طرح چشمہ سے اہل حاجت سیراب ہوتے ہیں اسی طرح عقل ہے کہ اسی سے انسان علوم و کمالات کا حصول کرتا ہے اور عقل مطلع ہے انوار و برکات کا۔ مطلع اُفق مشرق کو کہتے ہیں۔ جس طرح اُفق سے آفتاب طلوع ہوتا ہے اور عالم کو منور کرتا ہے اسی طرح عقل بھی انوار و برکات کا اُفق ہے اور عقل اساس العلوم ہے۔ یعنی علوم کی بُنیاد ہے۔ اگر عقل نہیں تو نہ دُنیا کی عمارت بنتی ہے نہ آخرت کی۔

علامہ ماوردی کی کتاب ادب الدنیا والدین میں ایک حکایت نظر سے گزری۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل خداوند تعالےٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جن کی ذہانت و فطانت مسلم اور مشہور ہے۔ اُن سے کسی نے سوال کیا کہ جب قیامت کے روز اوّلین و آخرین میدانِ حشر میں جمع ہوں گے

تو اتنے بے شمار آدمیوں کا حساب حق تعالےٰ کیسے لے لیں گے ؟ آپ نے فرمایا کہ جس طرح وہ اس وقت اپنی مخلوق کو رزق پہنچا رہا ہے اسی طرح اُس دن سب کا حساب بھی لے لے گا۔ ہر شخص کو ہر جگہ رزق اپنے وقت پر پہنچ جاتا ہے۔ حالانکہ روئے زمین پر خدا کی بے شمار مخلوق آباد ہے۔ پس جو خُدا بے شمار مخلوق کو بلا کسی غلطی کے رزق دیتا ہے اسی طرح وہ سب کا بیک وقت بلا کسی غلطی کے حساب بھی لے لیگا۔

اسی طرح ایک دفعہ کسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اُس کی رُوح کہاں چلی جاتی ہے ؟ فرمایا کہ جب چراغ جلتا ہے تو اس میں نور اور روشنی ہوتی ہے۔ بعدازاں فرمایا کہ جب اس کو بجھا دیتے ہیں تو بتلاؤ کہ وہ نُور کہاں چلا جاتا ہے ؟ یہ جوابات عقل ہی کی بدولت ان حضرات کے ذہن میں آتے تھے۔

عقل کی حقیقت

یہاں تک عقل کی فضیلت کا کچھ مختصر سا بیان ہوا۔ اب اس کی حقیقت بھی سمجھ لیجئے کہ عقل ہے کیا چیز ؟ علمار نے اُس کی حقیقت میں کلام کیا ہے۔ ایک گروہ نے تو یہ کہا ہے کہ اس کی حقیقت معلوم نہیں۔ لیکن جمہور علمار کا یہ مسلک ہے کہ اس کی حقیقت معلوم ہے۔ چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ عقل جوہر لطیف ہے۔ یعنی ایک امر جوہری ہے جو قائم بذاتہ ہے یہ ایک اصطلاح ہے مطلب یہ ہے کہ ایک "امر" عرضی ہوتا ہے ایک "امر" جوہری۔ امر عرضی اسے اس کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ پایا جائے۔ جیسے سیاہی اور سفیدی

کہ مثلاً کپڑے وغیرہ میں ہوتی ہے اور امر جوہری وہ ہے جو خود اپنے وجود میں مستقل ہو، یعنی اپنے قیام اور وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو۔ پس عقل کی ایک تعریف تو یہ کی گئی ہے کہ عقل ایک جوہر نورانی ہے جس سے حقائق کا ادراک اور حق و باطل کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور کسی نے کہا کہ عقل ایک قوت واستعداد کا نام ہے جس سے ادراک ہوتا ہے۔

ایک تعریف حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمائی کہ اللہ تعالےٰ نے انسان میں جو حواس خمسہ ظاہری پیدا فرمائے ہیں۔ ان میں سے سر کی آنکھ ظاہری اشیاء کو دیکھنے کے لیے پیدا کی ہے اور ایک آنکھ اللہ تعالےٰ نے دل میں پیدا کی ہے جس سے حق و باطل کا فرق معلوم ہوتا ہے اور اسی دل کی آنکھ کو عقل کہتے ہیں۔ جس سے حق و باطل کی رنگتوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح آنکھ اگر رنگتوں کے فرق کو صحیح صحیح ادراک کرتی ہے تو وہ آنکھ تندرست ہے ورنہ وہ آنکھ بیمار ہے۔ اسی طرح عقل اگر حق و باطل کے فرق کو صحیح صحیح سمجھ رہی ہے تو تندرست ہے ورنہ وہ عقل بیمار ہے۔ اگر آنکھ سے ایک کے دو دکھائی دینے لگیں تو اس کو بھینگا کہا جاتا ہے اسی طرح اگر دل کی آنکھ سے کسی کو ایک اسلام کے دو اسلام اور ایک رسول کے دو رسول اور ایک قرآن کے دو قرآن نظر آنے لگیں تو سمجھ لو کہ اس کے دل کی آنکھ بھینگی ہو چکی ہے اگر بینائی درست ہو تو ایک نظر آنے لگے۔

آج کل عموماً لوگ کہا کرتے ہیں کہ احکام اسلام کو ہم خود عقل سے سمجھ لیں گے۔ ان سے یہ کہنا ہے کہ یہ آپ کا فرمانا تو درست ہے مگر ذرا ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم آپ کی عقل کو دیکھ لیں کہ کیا وہ ٹھیک

ہے یا نہیں ؟ کیونکہ جب عقل کو حق و باطل کا فرق ہی ٹھیک نہ نظر آئے تو وہ عقل، عقل ہی نہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ کسی شخص کی دل کی آنکھ درست ہے، سو اس کی مثال ایسی سمجھو کہ اگر کسی نابینا کے سامنے لذیذ کھانوں کا دستر خوان بچھا ہوا ہو تو اس کو کچھ بھی معلوم نہ ہو گا۔ پس جس طرح اگر انسان کی ظاہری آنکھ درست ہو تو وہ لذیذ کھانوں اور انواع و اقسام کی چیزوں اور نعمتوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی آنکھ ٹھیک ہے اور اگر کسی کو کچھ معلوم ہی نہ ہو تو اس کی آنکھ درست نہیں۔ اسی طرح اگر انسان کو اطاعت خداوندی کی طرف رغبت اور میلان ہے تو سمجھو کہ اس کے دل کی آنکھ درست ہے ورنہ دل نابینا ہے اور اسکو علاج کرنا چاہیئے۔ غرض جو معیار ظاہر کی آنکھ کی خرابی اور صحت کا ہے۔ وہی باطن کی آنکھ کا ہے۔ اگر کسی شخص کو سیاہ و سفید کا فرق نہ معلوم ہو تو اس کی ظاہری آنکھ خراب ہوتی ہے اسی طرح جس شخص کو زنا اور نکاح میں فرق معلوم نہ ہو اس کی باطن کی آنکھ خراب ہو گئی ہے۔ جیسے کسی کو پانی اور پیشاب میں فرق معلوم نہ ہو اور گلاب اور سڑے ہوئے بدبودار پانی کو یکساں خیال کرے تو ظاہر ہے کہ اسکی قوت شامہ اور ذائقہ مختل ہو چکی ہے اسی طرح جس کو حق و باطل کا فرق محسوس نہ ہو تو اسکی عقل بیمار اور خراب ہے۔ غرض عقل اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی عقلمند نہیں اور امام احمد بن مسکویہ نے اسکی ایک دلیل عقلی بیان فرمائی ہے وہ یہ کہ دیکھو دنیا میں بڑے بڑے بادشاہ، امراء اور رؤساء و سخی گزرے ہیں جنہوں نے اپنی دولت کے خزانے لٹا دیئے مگر پھر بھی کوئی شخص ان کا عاشق نہیں ہوا۔ اور انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ

دو دو مہینے چولہا نہیں جلتا مگر ایک نہیں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں
ان کے عاشقان جان نثار موجود ہیں۔ یہ عشق عقل کے کمال ہی کی وجہ سے تو ہے
کسی بے عقل پر کوئی عاشق نہیں ہوا کرتا۔ حضرات انبیاء کرام کی عقل کے کمال اور
حُسن و جمال ہی نے اُن کو عاشق بنایا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کا ایک قصیدہ ہے جس میں اُنہوں نے
فرمایا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم پر نبوت تو ختم ہو ہی گئی مگر آپ پر محبوبیت کا
بھی خاتمہ ہو گیا۔ لیلےٰ کا تو صرف ایک ہی عاشق سُنا گیا ہے اور یہاں تو سارا عالم ہی
عاشق ہے۔ آج چودہ سو برس کے بعد بھی آپ کے عاشقوں سے عالم بھرا پڑا ہے۔
بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ شریعت کی باتیں ہماری عقل میں نہیں آتیں اور یہی ان کی
بے عقلی کی دلیل ہے کیونکہ اُنہوں نے حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ شریعت کی باتیں خلافِ عقل نہیں بلکہ
فوق العقل ہیں۔ خلافِ عقل وہ بات ہوتی ہے کہ وہ عقل میں آجاوے اور عقل اس
پر حاوی ہو جاوے اور پھر وہ اس بات پر یہ حکم لگائے کہ یہ درست ہے یا غلط ہے
لیکن فوق العقل کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کا حکم عقل سے اتنا بلند اور بالا ہے
کہ عقل کی وہاں تک رسائی ہی نہیں اور جب رسائی ہی نہیں تو عقل اس پر کیسے
حکم لگا سکتی ہے؟ غرض اس فرق کو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔

اب دُعا کرو کہ خدا تعالےٰ ہماری عقل کو عقلِ سلیم بنائے اور ہم
کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔

وعظ نمبر ۸

عقل کی تعریف

اور اُس کی اقسام اور اُس کا محل!

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ والہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ وذریاتہٖ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ ؕ

"بے شک اس میں البتہ نصیحت ہے اُس شخص کے لیے جس کا دل ہو یا وہ کان لگا کر سُنے اور وہ حاضر ہو۔"

یہ قرآن مجید کی وہی آیت ہے جو گذشتہ جمعہ مَیں نے آپ کے سامنے تلاوت کی تھی اور عقل کی فضیلت اور اس کی تعریف اور اس میں حکماء و علماء کے اقوال بیان کئے تھے۔ آج ارادہ ہے کہ اس کے بارہ میں دیگر حکماء کے اقوال بیان کروں۔ اور اس کے بعد یہ بتاؤں کہ عقل کا محل وقوع کیا ہے یعنی عقل جسم انسانی میں کس جگہ ہے سو اس کی تعریف میں امام شافعیؒ کا قول ہے کہ :۔

آلَۃُ التَّمْیِیْزِ وَالْاِدْرَاکِ ۔ "یعنی وہ دو چیزوں میں شناخت کرنے اور ادراک کرنے کا آلہ ہے"۔

اور حارث محاسبی نے کہا ہے کہ عقل ایک قوت عزیزیہ طبیعیہ کا نام ہے جو خدا نے انسان میں ودیعت رکھی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے ادراک کرتا ہے اور اشیاء کے فرق کو معلوم کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہے۔ اس تعریف کی بنا پر عقل عرض ہوئی نہ کہ جوہر۔ اور بعض علماء نے اس کی تعریف میں کہا ہے کہ :۔

مَا عَقَلَ الْاِنْسَانَ عَنِ السَّیِّئَاتِ وَحَضَّ الْقَلْبَ عَلَی الْحَسَنَاتِ ۔ "جو انسان کو برائیوں سے باز رکھے اور دل کو اچھے کاموں پر ابھارے"۔

"عقل" کے معنی روکنے کے ہیں۔ اسی لیے "عقال" رسی کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ حرکت کرنے سے روک دیتی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عقل اس قوت کا نام ہے جس کے ذریعے سے انسان اچھے بُرے کا فرق معلوم کرے کہ نفع و ضرر میں اور لذّت و الم میں تمیز کرلے۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ عقل ایک چراغ ہے کہ جس کے ذریعے سے انسان کی جہالت کی ظلمت دُور ہو جاتی ہے اور وہ ایسا روشن چراغ ہے کہ اگر وہ خارج میں محسوس طریق پر موجود ہوتا تو اُس کی روشنی کے آگے آفتاب کی روشنی ماند ہو جاتی کیونکہ جہل کی ظلمت رات کی تاریکی سے کہیں بڑھ کر ہے تو آفتاب سے تو رات کی تاریکی دُور ہوتی ہے اور اس سے جہالت کی ظلمت دُور ہوتی ہے۔

علم اور عقل میں فرق

اللہ تعالےٰ نے انسان کو عقل دی ہے ادراک کرنے کے لیے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوگیا ہے کہ علم اور عقل ایک ہی شئے ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ میرے اُستاد فرماتے تھے کہ عقل اور علم میں فرق ہے اور اس کی توضیح کے لیے مثال دیتے تھے کہ جیسے ایک آئینہ ہے جس میں باہر کی چیزیں منعکس ہو جاتی ہیں اور ایک نقشہ ہے کہ وہ کسی کاغذ وغیرہ پر کھنچا ہُوا ہے۔ مثلاً ہم کو یہاں سے اسٹیشن جانا ہے اور ہم روانہ ہوگئے تو عقل کے اندر راستہ کا ایک نقشہ موجود ہے کہ مثلاً راستہ میں پہلے ایک بازار آئے گا۔ پھر اس سے نکل کر ایک چوڑی سڑک آجائے گی۔ آگے چل کر ایک حلوائی کی دوکان ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو اب سمجھئے کہ یہ نقشے جو انسان کے ذہن میں کھنچے ہوئے ہیں یہ تو علم ہے اور عقل آئینہ ہے جس میں یہ تمام نقشے محفوظ ہیں اور منعکس ہیں اور خدا تعالےٰ کی یہ بھی عجیب صناعی اور قدرت ہے کہ انسانی عقل میں ہزاروں نقشے محفوظ ہیں۔ مگر ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ نہیں ہوتے۔ غرض یہ تو عقل کی تعریف تھی جس میں مختلف عنوانات بیان ہُوئے۔

عِبَادَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُکَ وَاحِدٌ
فَکُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ

یعنی اگرچہ ہماری عبارتیں اور ہمارے عنوانات و تعبیرات مختلف ہیں مگر محبوب کا حُسن تو ایک ہی ہے لہٰذا ہر شخص اسی حسن و جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ :-

مَاقَسَمَ اللّٰہُ لِعِبَادِہٖ خَیْرًا مِنَ الْعَقْلِ ۔ "یعنی اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو عقل سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں عطا کی"۔

جب اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا ۔ تو حضرت جبریل علیہ السلام اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مَیں تین چیزیں لے کر حاضر ہوا ہوں ۔ ان میں سے آپ ایک کو پسند کر لیجیے ۔ پوچھا کہ وہ تین چیزیں کیا ہیں ؟ کہا کہ علمؔ ، عقلؔ ، دینؔ ۔

حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ مَیں ان میں سے عقل کو لیتا ہوں ۔ جب انہوں نے عقل کو لے لیا تو جبریل علیہ السلام نے علم اور دین سے کہا کہ تم واپس چلو کیونکہ تُم میں سے تو کسی کو قبول نہیں کیا گیا ۔ مگر اُنہوں نے جواب دیا کہ اب ہم واپس نہیں جا سکتے ۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کا یہ حکم ہے کہ ہم عقل سے جُدا نہیں ہو سکتے ۔ غرض جب عقل آتی ہے تو دین اور علم کو ساتھ لے کر آتی ہے ۔

علماء نے لکھا ہے کہ حق تعالےٰ نے چار مخلوقات پیدا فرمائیں ۔ ملائکہؔ حیواناتؔ ۔ بہائمؔ ۔ انسان و جناتؔ ۔

ملائکہ تو عقول محض ہیں بلا شہوت ۔ اور بہائم شہواتِ محض ہیں بلا عقل ۔ لیکن انسان اور جنات میں خدائے تعالےٰ نے ان دونوں کو جمع فرمایا ۔ لہٰذا اگر انسان نے شہوات کو عقل کا غلام بنا لیا تو یہ ملائکہ سے بھی بڑھ گیا اور عقل کو شہوتوں کا غلام بنا لیا تو بہائم و حیوانات سے بھی گر گیا ۔

کسی حکیم کا قول ہے کہ جو عقل غلام بن جائے نفسانی خواہشوں کی تو اس کی مثال اسیر اور قیدی کی سی ہے اور خواہش نفسانی اس پر حاکم اور امیر ہیں حالانکہ حق تعالےٰ نے عقل کو بادشاہ اور نفسانی خواہشوں کو غلام اور

رعیت بنایا تھا مگر انسان اپنی نالائقی سے ان کا غلام بن جاتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے عقل کو بادشاہ بنایا اور نفس بمنزلہ کتے کے ہے۔ جس طرح کتا گندی اور نجس چیزوں کو کھاتا اور پسند کرتا ہے۔ اسی طرح نفس کا میلان بھی معاصی کی طرف ہوتا ہے اور عقل ہمیشہ پاکیزہ اور پسندیدہ اشیاء کی طرف بڑھتی ہے اور پسند کرتی ہے تو کتے کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کو سکھا کر اپنا غلام بنالو تو اس کا پکڑا ہوا شکار کھانا حلال ہے ورنہ نہیں۔

اسی طرح اگر نفس کو غلام بنا کر اور مطیع بنا کر رکھو تو اس سے کام لیا جاسکتا ہے اور اس کا وجود مفید ہے ورنہ نہیں۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا یہ معمول تھا کہ جس دن ان کی کہیں دعوت وغیرہ ہوتی اور کھانا عمدہ کھاتے تو ساری رات جاگتے (اور خوب عبادت فرماتے کسی نے اُن سے سوال کیا کہ حضرت یہ کیا بات ہے؟

فرمایا کہ جب گدھے کو چارہ زیادہ دیا جاتا ہے تو اس سے کام بھی زیادہ لیا جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے انسان کو عقل سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں بخشی۔ لوگ کہتے ہیں کہ آج کل ترقی ہو رہی ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ موجودہ ترقی عقل کی ترقی نہیں بلکہ نفسانی خواہشوں کو ترقی ہو رہی ہے اور عقل انہی خواہشات کی غلام بنی ہوئی ہے اور جب عقل ہی غلام بن گئی تو پھر دین بھی گیا اور مروت بھی گئی، سب گیا۔ چنانچہ آج کل اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے کہ خود غرضی اور نفس پروری ترقی پر ہے

نفس کہتا ہے کہ خوب کماؤ اور خوب ساز و سامان جمع کرو۔ دولت اکٹھی کرو۔ نہ حلال کی فکر کرو نہ حرام کی۔ بس دولت جمع کرو۔ مگر عقل کا تو یہ تقاضا نہیں۔ عقل تو کہتی ہے کہ بے شک مال و دولت جمع کرو مگر حلال و حرام کا لحاظ رکھو۔

انبیاء علیہم السلام کا دین اور شریعت انسان کو عقل پر چلنے کا حکم دیتے ہیں اور موجودہ تمدن خواہشات نفسانی پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور جنات اور شیاطین کی صفت ہے مکر و حیلہ۔ آج کل یہی چیزیں روبہ ترقی ہیں۔ گویا شیطنت کو ترقی ہو رہی ہے اور عقل پر خنجر چل رہے ہیں۔ نفس کی خوب پرورش ہو رہی ہے اور عقل اور دین کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ نفس اور عقل میں فرق نہیں کرتے۔

عقل کا محل

اس کے بعد علماء نے اس بارے میں کلام کیا ہے کہ عقل کا محل اور اُس کی جائے وقوع کہاں ہے؟ اس کا بھی کچھ مختصر بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عقل انسانی دل میں رہتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا — "وہ اُن کے دل تو ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں"۔

اور حنفیہ اور حنابلہ نے فرمایا کہ عقل کا محل دماغ ہے اور دلیل یہ ہے

کہ اگر انسان کے دماغ پر کوئی کاری ضرب لگ جائے تو اس سے عقل جاتی رہتی ہے اور حکماء اور فلاسفہ نے کہا ہے کہ عقل انسانی روح میں ہے۔ جس طرح رُوح انسان کے سارے بدن میں سرایت کئے ہوئے ہے اسی طرح عقل رُوح میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور جس طرح بدن کی زندگی رُوح سے ہے اسی طرح روح کی زندگی عقل سے ہے اور حضرت مولانا شاہ محمد انور صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ عقل کا مقام دماغ ہے۔ کیونکہ دماغ خراب ہو جانے سے عقل بھی جاتی رہتی ہے۔ مگر میرے نزدیک ان دونوں اقوال میں کوئی تعارض اور اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ان میں تطبیق اس طرح پر ہے کہ یُوں سمجھیئے کہ عقل کا سرچشمہ اور منبع یعنی اُس کے اُبلنے کی جگہ تو قلب انسانی ہے۔ اور اس کا خزانہ جہاں جا کر یہ عقل جمع ہوتی ہے وہ دماغ انسانی ہے۔

عقل کی اقسام

اس کے بعد عقل کی قسمیں بھی سُن لیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے منقول ہے کہ عقل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عقل فطری و طبعی ہوتی ہے یعنی خدا تعالےٰ نے انسان کے اندر مادہ ادراک اور فہم کا رکھا ہے اور ایک عقل تجربی ہوتی ہے۔ یعنی جیسے انسان کو کسی کام کے کرتے کرتے اس میں مختلف قسم کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے اور اس سے انسان کو عقل آجاتی ہے۔ کسی نے بادشاہ کو نصیحت کی کہ مشورہ نوجوانوں سے بھی کرو۔ اور بوڑھوں سے بھی۔ کیونکہ جوانوں کی عقل تازہ ہوتی ہے اور اس میں تیزی اور فطانت ہوتی ہے اور بُوڑھوں کو تجربہ ہوتا ہے۔ اس طرح عقل طبعی اور عقل

تجربی دونوں جمع ہو جائیں گی۔

جاننا چاہیئے کہ عقل نام ہے ایک نور کا جو انسان کے اندر ہوتا ہے اور دین اور شریعت بمنزلہ آفتاب کے ہے۔ پس اگر اندر کا نور صحیح ہے تو شریعت کے آفتاب سے عقل مستفید ہو گی۔ ورنہ اس کے لیے بے فائدہ ہے جیسے نابینا کے لیے آفتاب کی روشنی بے کار ہے۔ اسی کو کسی نے عربی میں اس طرح کہا ہے:۔

رأیت العقل عقلین فمطبوع و مسموع

عقل کی دو قسمیں ہیں - ایک طبعی اور ایک سمعی۔

ولا ینفع مسموع اذا لم یك مطبوع

عقل سمعی اس وقت تک نافع اور مفید نہیں جب تک کہ عقل فطری اور طبعی اس کے ساتھ نہ ہو۔

کما لا تنفع الشمس وضوء العین ممنوع

جیسا کہ آفتاب کی روشنی اس وقت تک مفید نہیں ہوتی جب تک کہ آنکھ میں روشنی نہ ہو۔

نانوتہ میں ایک مولانا احمد احسن صاحب تھے وہ نظم کا ترجمہ نظم میں اور نثر کا نثر میں کرتے تھے انہوں نے ان اشعار کا ترجمہ یہی کیا ؎

دو ہیں عقلیں میرے نزدیک اے پسر! ایک طبعی ایک سمعی یاد کر!

فائدہ سمعی سے کچھ ہوتا نہیں جب نہ ہو طبعی کا دل میں کچھ اثر

جیسے سورج سے نہیں کچھ فائدہ گر نہ ہووے آنکھ میں نورِ بصر

حضرات! عقل اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کا انسان کو شکر ادا کرنا چاہیئے اور اس کا شکر یہی ہے کہ انسان اپنے مولائے حقیقی کی اطاعت اور

فرمانبرداری کرے اور اس کے کاموں میں لگا رہے۔ اُس کے احکام سے انحراف بے عقلی ہے۔

ایک دفعہ ایک بدّو کسی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے سوال کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ عمرؓ! اس نے سوال کیا کہ کیف امیر کم، یعنے تمہارا بادشاہ کیسا ہے؟ بدو نے نہایت جامع اور مانع جواب دیا اور کہا "امیرنا لایخدع ولا یخدعُ" ہمارا امیر ایسا ہے کہ جو کسی کو دھوکہ دیتا ہے نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔ اس نے ایک جملہ میں اُن کی پرہیز گاری اور تقوے کو بیان کر دیا اور دُوسرے میں اُن کے کمال عقل کو کہ کسی کو دھوکہ نہ دینا یہ کمال دیانت ہے اور کسی سے دھوکہ نہ کھانا یہ کمال عقل ہے۔ حکومت چلانے کے لیے ان ہی دو اوصاف کی ضرورت ہے۔

اب اللہ تعالےٰ سے دُعا کرو کہ خدا تعالےٰ ہم کو ایسی عقل دے جو ہم کو دین کی طرف اور خدا کی طرف لے جائے اور ایسی عقل سے بچائے جو ہم کو دُنیا کی طرف اور چالاکیوں اور چھل فریب کی طرف دھکیلے۔

وعظ نمبر ۹

عقل کے فوائد

اور

عقل اور نفس کے مزاج میں فرق

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ۔

"بلاشبہ اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لیے جس کا دل ہو یا وہ کان لگائے اور توجہ کرے اور وہ حاضر ہو۔"

عقل کی فضیلت اور اس کی حقیقت تو بیان ہو چکی ہے اور اس کی اقسام اور اس کا محل وقوع کا بھی بیان ہو چکا ہے۔ یعنی یہ کہ عقل کتنی قسم کی ہوتی ہے اور جسم انسانی میں اس کی جگہ کہاں ہے۔ اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ عقل کا فائدہ

کیا ہے ؛ عقل کے فائدے تو بے شمار ہیں ۔ جن میں سے اکثر و بیشتر سب کو معلوم بھی ہیں ۔ مگر عقل کا اصل فائدہ بلکہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان میں خدا تعالےٰ کے خطاب کی صلاحیت اور قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ اس سے خطاب فرمائے تو وہ اس کو سمجھ سکے ۔

خدا تعالےٰ نے انسان کو عقل دی کہ وہ اس کے احکام کو سمجھ سکے ۔ اسی لیے حق تعالےٰ کے احکام اور اس کا خطاب انسانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ خدا تعالےٰ شجر و حجر اور جمادات اور حیوانات سے خطاب نہیں فرماتا ۔ کیونکہ ان میں اتنی عقل ہی نہیں کہ وہ اس کے خطاب کو اور اس کے احکام کو سمجھ سکیں ۔ دُوسرے عنوان سے اس کو یوں سمجھئے کہ عقل کی وجہ سے انسان حقوق العباد اور حقوق اللہ کے ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ مجنون انسان سے نہ کوئی حق العباد وابستہ ہے نہ اُس سے کوئی حق اللہ متعلق ہے ۔ نہ اس سے کوئی بیع کرتا ہے نہ شرا کرتا ہے ۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ انسان بھی عجیب نادان واقع ہُوا ہے کہ جب خُدا تعالےٰ کے احکام اس کو پہنچتے ہیں تو وہ اس پر شاق گزرتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتا سمجھتا کہ خدا تعالےٰ نے یہ اس کو کتنی بڑی عزت بخشی ہے کہ اس سے خطاب فرما رہے ہیں ۔ شجر و حجر سے تو خُدا تعالےٰ کوئی خطاب نہیں فرماتا ۔ اس ظلوم و جہول کو امر و نواہی کی مشقت پر تو نظر ہے مگر اس عزت و سرفرازی پر نظر نہیں جو خدا تعالےٰ کی طرف سے عطا ہوئی ہے کہ اس کو اپنے کلام کا مخاطب بنایا ۔ غرض عقل وہ نعمتِ عظمیٰ اور سرمایۂ عزت و سربلندی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان خُدائے تعالےٰ

کے خطاب کے قابل ہو جاتا ہے اور عقل ہی کی بناء پر انسان دُنیا میں بادشاہوں کے خطاب کا بھی مستحق ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے:

وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ۔ "اور اس کو عالم ہی سمجھتے ہیں"

بعض علماء کا قول ہے کہ انسان کے نام جو اللہ تعالیٰ کے احکام آئے تو اُن کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص بالکل اندھیرے میں بیٹھا ہُوا ہو اور اس اندھیرے میں اس کے پاس بادشاہِ وقت کا فرمان پہنچے تو اب اس کو یہ حسرت ہوگی کہ کاش! اس وقت میرے پاس کوئی چراغ یا کوئی روشنی کا سامان ہوتا تاکہ میں اس فرمان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔ اسی طرح انسان کی عقل بمنزلہ چراغ کے ہے کہ انسان اس کی روشنی میں خدا تعالیٰ کے احکام کا مطالعہ کر رہا ہے جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جو انسان کو عقل کی دولت دی ہے وہ سب سے بڑی دولت ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں اور یہ دولت صرف دُنیا ہی میں نہیں بلکہ دُنیا اور آخرت دونوں میں سب سے بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کی یہ خصوصیت ہے کہ خُدا تعالیٰ نے اس میں ایک تدریج کی شان رکھی۔ یعنی دفعۃً اور ایک دم سے یہ دولت عطا نہیں فرما دیتے بلکہ رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ۔ چنانچہ دیکھئے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے تمام صلاحیتیں رکھی جاتی ہیں۔ حواس خمسہ وغیرہ اور عقل۔

غرض ہر چیز کی صلاحیت ہوتی ہے اور جُوں جُوں بچہ پرورش پاتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے عقل بھی بڑھتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اٹھارہ برس کی عمر میں جا کر انسان کی عقل مکمل ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ہی یعنی بلوغ کے بعد

ہی انسان مکلف یعنی خدا تعالےٰ کے احکام کا مخاطب ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بلوغ کے بعد ہی انسان کا جسم اور اس کی عقل پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ اس تدریج میں جو مصلحتیں اور حکمتیں ہیں وہ پوری طرح تو خدا ہی کو معلوم ہیں۔ مگر انسان کو اگر کوئی چیز یک لخت مل جاتی ہے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے یہ ساری طاقتیں بتدریج عطا فرمائیں۔ اور کبھی کبھی بیماری وغیرہ سے ان میں خلل بھی واقع ہوتا رہتا ہے تاکہ انسان مغرور نہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ عقل کی باگ ڈور خدا ہی کے ہاتھ میں ہے کہ جو بتدریج عطا ہو رہی ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کی مجلس میں یورپ کی ظاہری ترقی کا ذکر تھا کہ اُن لوگوں نے عجیب عجیب ایجادات کی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اس تمام ترقی کا دارومدار عقل پر ہے اور عقل کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے اس لیے نظر خدا ہی پر ہونی چاہیئے۔

اس کو ایک اور مثال سے سمجھیئے کہ انسان کا ایک وقت تو ولادت اور پیدائش کا ہے اور ایک وقت بلوغ کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے صبح صادق کے وقت دن شروع ہوتا ہے۔ لیکن صبح صادق کے وقت روشنی برائے نام ہی ہوتی ہے کہ اس کو مشکل سے روشنی کہا جا سکتا ہے ورنہ قریب قریب اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ پھر جب آفتاب نکل آتا ہے تب پوری روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس میں تمام قوتیں ودیعت ہوتی ہیں۔ مگر وہ اس قدر ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہیں ہی نہیں۔ مگر جوں جوں بچہ بڑھتا ہے اس کی صلاحیتیں اور قوتیں بھی ترقی پذیر

ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ جب بالغ ہو جاتا ہے تو اس کی عقل اور اس کا شعور کامل ہو جاتا ہے۔ فلاسفہ نے لکھا ہے کہ صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک آفتاب کو اٹھارہ انیس درجات طے کرنے پڑتے ہیں تو شریعت نے بھی بلوغ کی مدت اٹھارہ[ع] سال مقرر کی ہے اور بعض سرد مقامات میں ۱۹ سال میں بلوغ ہوتا ہے۔

عقل اور نفس میں فرق

غرض یہ تو عقل کا فائدہ تھا اور اس کے ضمن میں اور باتیں بھی آگئیں۔ اب ایک اور پہلو پر غور کیجئے۔ یہ کہ خدا تعالےٰ کا قضا و قدر کا کارخانہ عجیب و غریب ہے اور اس کی کنہ اور حقیقت کا سمجھنا محال ہے۔ خدا تعالےٰ نے عقل کے ساتھ ایک اس کا دشمن بھی پیدا فرما دیا اور وہ ہے نفس جو کہ انسان کو رذیل اور کمینہ باتوں کی طرف رغبت دلاتا ہے اور گناہوں پر اور لذات پر ابھارتا ہے۔

اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جسم انسانی ایک شہر ہے۔ پس جس طرح شہر میں ایک بادشاہ ہو اور ایک اس کی مجلس وزراء و امراء ہو اور دوسری طرف کچھ اس کے مخالف اور باغی لوگ بھی ہوں۔ سو جسم انسانی میں عقل بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور فکر و خیال و قوت ادراکیہ بمنزلہ وزراء کے ہیں اور اعضاء و جوارح بمنزلہ رعایا کے۔ اور نفس باغی ہے۔ جو بادشاہ (عقل) کے مقابلہ پر تلا ہوا ہے اور جوارح کو حرکات رذیلہ اور افعال کمینہ پر آمادہ کرتا ہے۔ سو اگر عقل نے تدبیر سے کام لیا۔ اور نفس کو قید کر کے ڈال دیا کہ اس کے تمام قوئے کو بے کار کر دیا تو امن رہے گا۔ ورنہ فساد۔ اب نفس مختلف قسم کے ہیں کسی کا نفس تو پھانسی دے دینے کے قابل ہے اور کسی کا نفس اس قابل ہے کہ اس کو قید و بند میں رکھا جائے اور

ع حنفیہ کے نزدیک بلوغ کی ۶ پندرہ سال ہے ۱۲ بہشتی زیور حصہ دوم صـ۴۲ بحوالہ شامی ۱۲ مشرف علی

بعض زجر و توبیخ سے بھی ٹھیک رہ سکتے ہیں۔ غرض یہ بادشاہ کا کام ہے کہ وہ مناسبِ حال سزا تجویز کرے۔ جیسے بادشاہ کے لیے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ باغیوں اور مفسدوں کی کڑی نگرانی رکھے کہ کوئی سر نہ اُٹھا سکے۔ اسی طرح عقل کا بھی سب سے بڑا کام یہ ہے کہ نفس کی نگرانی کرے اور اس کو ڈھیل نہ دے کہ وہ اسکے خلاف کوئی سازش کر سکے اور رعایا کو بغاوت پر آمادہ کر سکے۔

عقل اور نفس کے مزاج میں فرق

اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ عقل کی خواہش اور تقاضا کیا ہے اور نفس کے خواہشات اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ سو اس کی تفصیل کا تو وقت نہیں۔ ہاں اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ عقل انسانی مآل کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور نفس صرف حال کو دیکھتا ہے کہ اس کام کے کرنے میں فی الحال یہ فائدہ ہے اس لیے اس کو کر لینا چاہیئے اور عقل اس کے نتیجے اور انجام کو بھی سوچتی ہے کہ اگر اس کام کو کر لیا گیا تو اس کا کیا نتیجہ ہو گا۔ یہ فرق ہے عقل اور نفس کے مزاج میں اور قرآن مجید میں ہے کہ "وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" یعنی نیک انجام متقیوں کا ہوتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ عقل جب کسی چیز کے متعلق غور کرتی اور سوچتی ہے تو اس کے مالہ، وما علیہ کو سوچتی ہے اور نفس صرف یہ دیکھتا ہے کہ آیا اس میں منفعت ہے یا نہیں؟ صرف نفع پر نظر ہوتی ہے اور انجام سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:-

حُبُّ الشَّیْءِ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ "کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے"

مطلب یہ کہ عقل کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ۔ واقعی جب انسان محبت سے مغلوب ہوتا ہے تو عقل ماری جاتی ہے ۔ حضرت عباسؓ بڑے دانا اور عقل مند ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ جب کسی کام میں تردد ہو تو عقل سے سوچو اور عقل جو فیصلہ کرے اس پر عمل کرو ۔ لیکن بعض اوقات عقل بھی کسی معاملے میں فیصلہ نہیں کر پاتی ہے تو اس وقت یہ دیکھو کہ اس کام کو نفس پسند کرتا ہے یا نہیں ؟ اگر نفس پسند کرتا ہے تو سمجھو کہ یہ کام مضر ہے اور اگر نفس پر گراں ہے تو سمجھو کہ یہ کام درست ہے ۔

قرآن مجید میں ہے :-

وَعَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۔ "بسا اوقات بعض چیزوں کو تم گراں سمجھتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لیے نافع ہیں"

اس پر ایک دوست کا واقعہ یاد آیا کہ وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی معاملہ میں تردد پیش آئے تو عورتوں سے مشورہ کر لیا کرو اور پھر ان کی رائے کے خلاف عمل کرو ۔ بس وہی حق ہو گا اور فرماتے تھے کہ اگر کسی شق پر عورتیں متفق ہو جاتی ہیں تو مجھے اس کے خلاف پر شرح صدر ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ عورتیں ناقص العقل اور نفسانی خواہشات سے مغلوب ہوتی ہیں اور جس پر ناقصات العقل متفق ہونگی وہ ضرور گڑبڑ ہو گی ۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ عقل کسی کام کے کرنے یا کسی بات کے قبول کرنے کیلئے تلاش کرتی ہے برہان کو اور دلیل کو بخلاف نفس کے کہ وہ لذت اور شہوت کو تلاش کرتا ہے ۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ نفس کا تعلق اور رشتہ شیطان سے ہے ۔ نفس چونکہ شیطان کا جڑواں بھائی ہے اسلئے ہمیشہ شیطان کے بتائے ہوئے راستہ پر لے جاتا ہے اور عقل صحیح راہ کی رہنمائی کرتی ہے اور پانچواں فرق یہ ہے کہ عقل انسان کو نور اور روشنی کی طرف لے جاتی ہے اور نفس ظلمت اور اندھیروں کی طرف دھکیل دیتا ہے ۔ جیسا کہ

قرآن مجید میں ہے :۔

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم	"وہ اللہ سرپرست ہے ایمان والوں کا ، ان کو اندھیروں
من الظلمٰت الی النور والذین	سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کا دوست
کفروا اولیآءُ ھم الطاغوت یخرجونھم	شیطان ہے جو ان کو نور سے اندھیروں کی
من النور الی الظلمات ۔	طرف لے جاتا ہے "

انبیاء کرام علیہم السلام نور کی طرف لے جاتے ہیں اور شیطان اور نفس ظلمت اور تاریکی کی طرف ۔ عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ انسان انبیاء کرامؑ کا اتباع کرے ۔ اس لیے انسان کو چاہیئے کہ عقل کو حاکم بنا کر رکھے اور نفس کو مغلوب اور تابع بنا کر رکھے ورنہ ہلاکت کا باعث ہو گا ۔

غلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے عقل کو بھی پیدا کیا اور نفس و شیطان کو بھی ۔ دنیا میں نیکی بھی پیدا کی اور بدی بھی ۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

وَمِنْ كُلٍّ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ   "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا (مدمقابل) پیدا کیا "

سو پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم نفس کے کہنے پر چلنے لگو اور اسکا اتباع کرنا شروع کر دو ۔ جیسے کہ پیشاب بھی پیدا کیا اور گلاب بھی ۔ مگر کوئی شخص بھی گلاب پر پیشاب کو ترجیح نہ دیگا ۔ ہاں ہندو قوم کا مذہب یہ ہے کہ گائے کا پیشاب تبرک ہے ۔ اور زمزم کا پانی ان کی نظر میں ناپاک اور نجس ۔ گائے کا پیشاب تبرک اور پاک ہو اس بدعقلی کا کوئی علاج ہی نہیں اور دُنیا میں مذہبین کو اس لیے پیدا کیا کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے ۔ دیکھتا ہے کہ کون نفس و شیطان کی راہ پر چلتا ہے ۔ اور کون انبیاء علیہم السلام کی راہ پر ۔ سو عقل کے مقتضیٰ پر چلنے سے دین و دُنیا کی کامیابی ہے اور نفس کے کہنے پر چلنے سے دونوں کی بربادی ۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عقل کے اس بیان کرنے سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ مجھے عاقل ہونے کا دعویٰ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ عقل سے بڑھ کر کوئی شئے حسین و جمیل نہیں اور عقل کا جمال لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہے۔ اگر نظر آ جائے تو سب کو چھوڑ کر دیوانہ وار اس کے پیچھے ہو جائیں۔ اسی طرح نفس کی بدشکلی اور بدصورتی لوگوں سے مستور ہے۔ ورنہ اس سے کوسوں دُور بھاگیں۔ سو حضرات جیسے کوئی بدشکل اور بدصورت انسان کسی حسین و جمیل اور ماہر کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کو اپنے حسن و جمال کا دعوے ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے جمال پر عاشق ہے۔ اسی طرح ہم کو عقل کے ساتھ عشق ہے اس لیے اس کے مناقب بیان کر رہے ہیں ورنہ عاقل ہونے کا دعویٰ نہیں۔

اب حق تعالےٰ سے دُعا کیجئے کہ خدا تعالےٰ ہم کو عقل سلیم عطا فرمائے اور عقل کے مقتضیات پر چلنے کی اور انبیاء کرامؑ کے اتباع کی توفیق بخشے۔

آمین ! یارب العالمین ۔ بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین ۔ برحمتک یا ارحم الرّاحمین ط

تاریخ فرشتہ اُردو

ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی اپنی تاریخ سے واقف ہوں تاریخ فرشتہ کسی تعارف کی محتاج نہیں اس سے زیادہ ضخیم تاریخ اب تک مرتب نہیں ہوسکتی محمد قاسم فرشتہ نے سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی تاریخ مرتب کی اور اس زمانہ کے دستور کے مطابق اس کتاب کا نام تاریخ ہند کے بجائے تاریخ فرشتہ مشہور ہوگیا۔ یہ اردو ترجمہ موجودہ زمانے کے انداز نگارش کیمطابق ہے نیز جا بجا حواشی بھی دیئے گئے ہیں جن میں قدیم شہروں اور دریاؤں کے موجودہ نام اور انکے جغرافیائی حالات بھی درج کئے گئے ہیں۔ یہ غیر منقسم ہندوستان کی نہایت مفصل تاریخ ہے خاص خاص عنوانات ملاحظہ فرمائیں تاکہ آپ کچھ اندازہ کرسکیں۔

ہندوستان کب اور کسطرح آباد ہوا نسلِ انسانی کی تقسیم۔ مہابھارت کی جنگ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ۶۳ھ میں۔ تذکرہ سلاطین لاہور۔ سلاطین دہلی سلاطینِ دکن۔ سلاطین ملتان۔ سلاطین سندھ۔ سلاطین گجرات، سلاطین کشمیر۔ سلاطین بنگال۔ شاہانِ مغل —— تاریخ فرشتہ کا مولف محمد قاسم فرشتہ نظام شاہی لشکر میں اپنی سرگذشت اور چشم دید واقعات کا بیان فرنگیوں سے جنگیں اور اسی کے ساتھ بے شمار تاریخی شہروں کے تذکرے۔

وعظ نمبر ۱۰

عقل کا منصب اور مقام

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ وذریاتہٖ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا۔ اما بعد

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۔ اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ۔ "وہ حاکمیت صرف اللہ ہی کے لیے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت مت کرو۔"

گذشتہ جمعوں میں عقل کے متعلق بیان ہوتا رہا۔ اس بیان کا اصل مقصد آج بیان کرنا ہے اور وہ یہ کہ عقل کا مرتبہ اور مقام کیا ہے؟ سو اس کا اجمالی جواب سُن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ عقل عالم ہے حاکم نہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ عقل کا کام یہ ہے کہ جو احکام خدا تعالےٰ کی طرف سے آئیں اُن کو سمجھے اور اُن کا ادراک کرے اور پھر اُن پر چلے اور یہ منصب عقل کا نہیں کہ وہ یہ حکم کرے کہ

فلاں کام کرو اور فلاں کام مت کرو۔ حکم دینا اس کا منصب عقل کا نہیں بلکہ حکم کی تعمیل کرنا اس کا منصب ہے۔ یہ اجمالاً عرض کر دیا ہے۔ اب مجھے اسی کی تشریح کرنا ہے۔

آج کل یہ فتنہ عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اگر کسی کے سامنے ہم شریعت کا کوئی حکم بیان کرتے ہیں تو نہایت بے باکی سے بے دھڑک ہو کر کہہ دیتا ہے کہ ہماری عقل میں نہیں آتا۔ اگر اس کے جواب میں اُن سے کہا جاتا ہے کہ بھائی یہ خدا کا حکم ہے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر مان لو۔ تو وہ اس پر کہتے ہیں کہ آخر خدا تعالےٰ نے ہم کو عقل جو دی ہے وہ اس لیے تو دی کہ ہم اس سے کام لیں ورنہ عقل بے کار ہو گی۔ سو اس کے جواب کی تفصیل غور سے سُنیئے اور سمجھیے۔ کیونکہ یہ فتنہ بہت سخت ہے۔ سو میں پہلے عقل کی تعریف میں بتا چکا ہوں کہ جیسے اللہ تعالےٰ نے ایک ظاہر کی آنکھ بنائی ہے جس سے انسان دیکھتا ہے اسی طرح ایک دل کی اور باطن کی آنکھ بنائی ہے جس سے نیک و بد کا امتیاز کرتا ہے اور یہی باطنی آنکھ عقل ہے تو یہ مشاہدہ ہے کہ جس طرح ظاہری آنکھیں انسانوں کی مختلف اور متفاوت ہیں یعنی کسی کی نگاہ دُور بین ہے کسی کی قریب بین ہے کوئی کانا ہے کوئی بھینگا ہے۔ اسی طرح عقل بھی لوگوں کی مختلف ہے اور جب عقلیں مختلف اور متفاوت ہیں۔ یعنی کوئی شخص زیادہ عاقل ہے اور کوئی کم عاقل ہے۔ تو اب آپ کا یہ کہنا تو درست ہے کہ خدا تعالےٰ نے ہم کو عقل دی ہے۔ بے شک خدا تعالےٰ نے آپ کو عقل دی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ آپ کی عقل بالکل تندرست ہے یا بیمار ہے۔ کیونکہ جس طرح دیکھنا اسی شخص کا حجت ہے جس کی بینائی ٹھیک اور صحیح و سالم ہو اسی

طرح عقل بھی اسی شخص کی حجت ہے کہ جس کی عقل بیماریوں اور آلائشوں سے پاک ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ جیسے انتیس کا چاند ہے کہ قوی البصر لوگوں کو تو نظر آجاتا ہے مگر جس شخص کی نگاہ کمزور ہو اور اس کو بوجہ اپنی نگاہ کی کمزوری کے چاند نظر نہ آیا اور وہ یوں کہنے لگے کہ چونکہ مجھ کو چاند نظر نہیں آیا۔ اس لیے مَیں نہیں مانتا کہ چاند ہُوا ہے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری بینائی ہی کمزور ہے اس لیے تجھ کو چاند نظر نہیں آرہا۔ اسی طرح اگر خدائے تعالےٰ کا کوئی حکم آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا تو وہ آپ کی عقل کا قصور ہے نور کا قصور نہیں۔ اور یہ تو خدا تعالےٰ کے احکام ہیں۔ دُنیا کے حکام کی طرف سے اگر کوئی حکم جاری کیا جائے تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میری سمجھ میں چونکہ یہ حکم نہیں آیا اس لیے میں اس کو نہیں مانتا۔ اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ خواہ آپ کی سمجھ میں آوے یا نہ آوے آپ کو ماننا پڑے گا۔ اور اگر آپ نے وہاں یہ تقریر کرنی شروع کی کہ صاحب آخر خدا نے ہم کو عقل دی ہے تو کیا یہ بیکار ہے؟ ہم کو اس سے کام لینا چاہیئے تو پھر سیدھے جیل میں بھیج دیئے جائیں گے اور دُنیا کے احکام میں تو یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص رعایا میں حاکم سے زیادہ عقل مند، فہیم اور زیادہ تعلیم یافتہ ہو مگر اس کے باوجود حکم حاکم ہی کا معتبر ہوگا۔ تو جب حکام مجازی کے احکام میں مجالِ انکار نہیں تو خدائی احکام میں کہاں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

جھک مار کر ماننا پڑے گا اور عمل کرنا پڑے گا۔ اور میری ان باتوں سے یہ نہ سمجھئے کہ مَیں زبردستی آپ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ بلاوجہ جذبات کی رَو میں

یہ باتیں کر رہا ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آخر سوچیے اور سمجھیے کہ اگر ہر شخص کی عقل کو معیار مان لیا جائے اور ہر شخص اس بات کا مدعی ہو کہ جو کچھ میری سمجھ میں اور میری عقل میں آوے گا وہ قابلِ عمل ہے اور اس کے علاوہ سب خلافِ عقل ہے تو دُنیا کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ اس لیے کہ اسی دُنیا میں ایک گروہ ایسا ہے کہ جو خُدا کی وحدانیت کا قائل ہے۔ اور ایک گروہ ہے کہ وہ سرے سے خُدا کا انکار ہی کرتا ہے اور ایک گروہ ہے کہ جو تین خداؤں کا قائل ہے۔ حتیٰ کہ ایک گروہ ۳۳ خداؤں کا قائل اور ماننے والا ہے۔ اب اگر یہ سب باطل پرست یہ کہیں کہ صاحب ہماری عقل میں تو یہی صحیح ہے تو آپ کیا کہیں گے اور کیسے تمام اضداد اور نقائض کو صحیح مان لیں گے۔

پس اگر ہر شخص کی عقل حجت ہو تو دُنیا میں اجتماع نقیضین لازم آئے گا جو تمام عقلاء کے نزدیک محال ہے اور اگر ہر شخص کی عقل حجت ہے تو پھر دُنیا میں کوئی لڑائی جھگڑا ہی نہ ہو۔ اس وقت دُنیا کی دو سب سے بڑی طاقتیں یعنی رُوس اور امریکہ ہیں اور دونوں عقل اور سمجھ کے مدعی ہیں، مگر دیکھیے ان میں کتنا اختلاف ہے کہ ایک دُوسرے کا دُشمن بنا ہُوا ہے۔ یہ حال تو ان قوموں کا ہے جو عقل کے مدعی ہیں اور دُنیا بھی اُن کی عقل کے آگے سر جھکائے ہوئے ہے۔ پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں کی عقل حجت ہے۔ پھر آخر کس کی عقل کو حجت قرار دیا جائے؟ آخر کار اس بات کو ماننا پڑے گا کہ ہر عقل حجت نہیں۔ پس ہر عقل کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں کہ میری عقل میں نہیں آتا۔ اس لیے اب یہ سوچنا اور غور کرنا چاہیئے کہ کون سی عقل حجت اور معتبر ہے اور کونسی غیر معتبر۔

پہلی بات تو یہ ہُوئی کہ دُنیا میں عقول مختلف ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ

خدا نے ہم کو عقل دی اور اس کے ساتھ ایک قدرت دی جس کے ذریعہ سے ہم وہ کام کر لیتے ہیں جو ہماری عقل میں آتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے انسان کے ساتھ نفس اور شہوتوں کو بھی پیدا کیا۔ چوتھے انسان کے ساتھ وہم کو پیدا کیا۔ اب عقل جن کاموں کے کرنے کو کہتی ہے نفس اس سے انکار کرتا ہے اور مانتا نہیں۔ اور نفس جن باتوں کو چاہتا ہے ان کو عقل قبول نہیں کرتی۔ عقل کی ایک کش مکش تو نفس کے ساتھ ہے دوسری کش مکش اس کو وہم کے ساتھ ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی تنہا مکان میں ایک مُردہ پڑا ہُوا ہو تو انسان اس کے پاس رات کے وقت نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہم یہ کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ آدمی رات کو یہ اُٹھ کر مجھے لپٹ جائے اور عقل کہتی ہے کہ یہ مُردہ ہے بے جان ہے اس سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔ مگر وہم برابر اُس کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اب آدمی حیران ہے کہ کیا کروں؟ پھر اس کے ساتھ ایک قوتِ غضبیہ بھی پیدا کی گئی۔ یعنی غصہ کی قوت۔ جب کوئی بات انسان کی منشار اور اُس کی رضی کے خلاف ہو تو فوراً وہ مرنے اور مارنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ سو ایک کشمکش عقل کو اس قوتِ غضبیہ کے ساتھ ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ دُنیا میں انسانوں کی حاجتیں اور ضرورتیں ایک دُوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان میں انسان ہمیشہ اپنے ہی فائدے کا پہلو تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انصاف سے کام لیا جائے اور سب کی ضرورتوں کی رعایت کی جائے۔ مثال کے طور پر ایک مکان ہے اور اُس کے دس آدمی طالب ہیں۔ تو ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ مجھے مل جائے اور اس کو دوسروں کی ضرورت کا

کوئی پاس نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ انسان میں ایک اور جذبہ ہے اور وہ یہ کہ میں کسی سے مغلوب ہو کر اور دب کر نہ رہوں بلکہ سب سے بلند و بالا رہوں۔ اب ان حالات میں انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کی عقل کو معیار بنائے۔ سو شریعتِ مقدسہ نے اس کا فیصلہ فرمایا اور بتایا کہ کون سی عقل معیار ہے۔ ارشاد ہے :۔

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۔ "مگر وہ شخص کہ جو عقلِ سلیم رکھتا ہو"

اس سے معلوم ہوا کہ معیار وہ عقل ہے جو کہ سلیم ہو اور تندرست ہو۔ اور تندرست کا مطلب یہ ہے کہ نفسانی شہوتوں سے پاک ہو اور ان کا شائبہ بھی اُس میں نہ رہا ہو اور جو عقل نفسانی خواہشوں میں ملوث ہو وہ کچھ رہنمائی نہیں کر سکتی۔

غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ انسانوں کی عقلیں اوّل تو مختلف ہیں کہ کوئی کیسی ہے کوئی کیسی ہے۔ دُوسرے یہ کہ عقلیں بیمار ہیں۔ کچھ نہ کچھ روگ ضرور لگا ہوا نظر آتا ہے۔ ان حالات میں ضرورت ہے ایک ایسی عقل کی کہ جو بالکل تندرست ہو اور جو نفسانی خواہشوں سے بالکل پاک ہو اور وہ انبیاء علیہم السلام کی عقل ہے جن کے بارے میں ارشاد ہے :۔

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى "وہ کوئی کلام خواہش نفسانی سے نہیں فرماتے"

اور ایک جگہ حضرت داوٗد علیہ السلام کے واقعہ میں ہے :۔

یاداؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ "اے داؤد! بیشک ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے

يُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ ط رہنا اور نفسانی خواہش کا اتباع مت کرنا

ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے بھٹکا دے "

اس سے معلوم ہُوا کہ ہوائے نفسانی گمراہی کا سرچشمہ ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ انسان کی گمراہی کے دو سبب ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ انسان غلط علم اور غلط عقل کی وجہ سے گمراہی کا راستہ اختیار کرلے۔ اور ایک یہ کہ نفس سے مغلوب ہو کر غلط راستہ پر چل رہا ہے۔ یعنی صحیح راستہ معلوم ہے اور عقل اور علم اس کو صحیح رہنمائی کر رہے ہیں مگر نفسانی خواہشات میں گھِرا ہُوا ہے کہ کبھی صحیح راہ پر چلتا ہے پھر گر پڑتا ہے۔ سو پہلی قسم کے جو لوگ ہیں یعنی کافر اور مشرک۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ جس قدر بھی چلیں گے اور دوڑیں گے اتنا ہی راستہ سے دُور ہوتے چلے جائیں گے اور کبھی بھی منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکیں گے اور دُوسری قسم کے لوگ یعنی گنہگار مسلمان۔ یہ گرتے پڑتے کبھی نہ کبھی منزل پر پہنچ ہی جائیں گے۔

غرض یہ ہے کہ خواہش نفسانی وہ چیز ہے جو انسان کو خدا کے راستہ سے اور صراطِ مستقیم سے ہٹاتی ہے اس لیے رہنمائی کے قابل اور اتباع کے قابل وہی عقل ہو سکتی ہے جو یکسر خواہش نفسانی سے پاک ہو اور یہ عقل خدا نے انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا فرمائی۔

اب یہ سمجھیے کہ عقل کامل اور تندرست کی پہچان کیا ہے؟ کیونکہ ہر شخص آج کل عقل کا مدعی بنا پھرتا ہے اور کوئی احمق سے احمق انسان بھی اپنے کو بیوقوف ماننے کو تیار نہیں بلکہ اگر کسی کو بے عقل کہہ دیا جائے تو وہ لڑنے اور مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لڑنا ہی بیوقوف ہونے کی کافی دلیل ہے۔ اسکو ایک

مثال سے سمجھ لیجیئے۔ یہ عقل جو خدا تعالے نے انسان میں پیدا کی ہے یہ نظر تو آتی نہیں
حتیٰ کہ کوئی شخص اگر اپنے دل کو چیر کر بھی اس کو تلاش کرے تو نہ ملے گی۔ لیکن عقل
کے آثار تو نظر آتے ہیں۔ اس لیے جس شخص کی حرکات وسکنات شائستہ ہیں وہ عاقل
ہے ورنہ دیوانہ اور پاگل ہے۔ سو اب اس معیار کو لیکر انبیار علیہم السلام کی عقل کو
دیکھئے تو ان حضرات کی شان یہ ہے کہ ان کی زبان سے جو لفظ نکلتا ہے تو سوائے
سچ اور حق کے کچھ نہیں نکلتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی پیشین گوئی فرماتے ہیں تو وہ بھی حرف
بحرف ضرور پوری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مخلوق نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ
کیا کہ ان حضرات کے اخلاق بھی اعلےٰ درجے کے ہوتے ہیں کہ اخلاق کا اس سے اُونچا مقام
کوئی تصوّر میں نہیں آسکتا۔ اور پھر اس کے علاوہ خدا تعالےٰ نے ان حضرات کے
ہاتھوں اپنی قدرت کے عجیب عجیب کرشمے ظاہر فرمائے۔ حتیٰ کہ مادرزاد اندھے صرف
ہاتھ پھیرنے سے بینا ہو گئے جن کو معجزات کہتے ہیں۔

غرض کہ اللہ تعالےٰ نے انبیار علیہم السلام کو اس شان سے پیدا کیا اور
ان میں ایسی امتیازی خصوصیات عطا فرمائیں کہ اُن کے بارے میں مخلوق کے
ذہن نشین دو باتیں ہو جائیں۔ اوّل یہ کہ یہ حضرات نفسانی خواہشوں سے بالکل
بالاتر اور نفسانی شہوتوں سے بالکل پاک ہیں۔ دُوسرے یہ کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ ان
کو خدا تعالےٰ سے خاص تقرب حاصل ہے۔ اور ان کا خدا تعالےٰ سے ایک
خصوصی تعلق ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگ اُن کے آگے جُھک گئے اور مخلوق کی گردنیں
ان کی عظمتوں کے سامنے خم ہو گئیں اور انبیار علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ان ہی کی
ہدایت سے تمام عالم کی اصلاح ہوتی ہے۔

عقل کا نُور حق تعالےٰ کی طرف سے چلا اور اس کا پَرتو سب سے پہلے

انبیاء علیہم السلام پر پڑا۔ اور انبیاء کی عقل کا پرتو زمین پر پڑا۔ گویا یوں سمجھئے کہ عقل کا سرچشمہ آفتاب ہے اور انبیاء علیہم السلام بمنزلہ چاند کے ہیں۔ اور فلاسفہ کے ہاں یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ:-

نُورُ الْقَمَرِ مُسْتَفَادٌ مِّنْ نُوْرِ الشَّمْسِ۔ "چاند کا نور آفتاب کے نور سے مستفاد ہے"

حضرات! انبیاء کا نورِ عقل۔ نور خداوندی سے مستفاد ہے اور باقی عالم بمنزلہ زمین کے ہے۔

وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں کہ خدا نے جتنی عقل تمام عالم کو تقسیم کی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کی عقل اس سب سے برتر اور بالا ہے اور دلیل اس کی قرآن و حدیث ہے کہ اس میں غور کر کے دیکھ لو کہ حضور پرنورؐ صلے اللہ علیہ وسلم جو شریعت لے کر آئے اُس میں کیسی کیسی حکمت اور علم کی باتیں ہیں کہ عقل انسانی حیران ہے۔ جسکے سامنے تمام حکماء کی حکمتیں بے حقیقت ہیں۔

لوگوں نے آج کل "باطنی" ہماری عقل کا بڑا شور مچا رکھا ہے اور ہر شخص اپنے کو دُنیا کا سب سے بڑا عاقل خیال کرتا ہے اور اپنے سامنے کسی کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتا۔ خصوصاً اگر کسی نے دو چار ڈگریاں حاصل کر لیں تو اس کو تو گویا عاقل ہونے کی سند مل گئی۔ تو حضرات ذرا اپنی عقل کا امتحان کرائیے اور یاد رکھئے کہ عقل دعووں سے نہیں ملتی۔ بلکہ عاقل وہ ہے کہ جس کے سامنے عقلاء کی گردنیں جھک جائیں۔ جیسے عالم وہ ہے کہ جس کے آگے علماء کی گردنیں سرنگوں ہو جائیں۔ مثلاً کوئی شخص دعوےٰ کرے کہ میں طبیب ہوں تو اب کیسے معلوم ہو کہ یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے یا غلط۔ تو جیسے اس کو

پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگ جو اس کے مطب میں جاتے ہیں اگر وہ شفایاب ہو کر آتے ہیں تو وہ طبیب ہے ورنہ نہیں۔ اسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں مطب کھولا۔ اب جو بُت پرست اور مشرک آپ کی خدمت میں جارہا ہے وہ پکا موحد اور خدا پرست ہو کر نکل رہا ہے اور فقط اتنا ہی نہیں کہ مریض مرض سے شفایاب ہو کر واپس آرہا ہے بلکہ مریض وہاں سے طبیب بن کر نکلتا ہے۔ پھر بھی اگر کسی کو اس کے طبیب ہونے میں شک ہے تو سمجھ لو کہ وہ عقل و دانش سے کورا ہے۔

حضرات! اگر کسی کو اپنی بیماریوں اور اپنے باطنی امراض اور روحانی روگ کا علاج کرانا ہے تو نبی کے سامنے سر جُھکا دے۔ ورنہ اپنی نابینائی اور مرض پر راضی رہے۔ مریض اپنا علاج نہیں کر سکتا۔

آپ دُعا کرو کہ خُدا تعالےٰ ہم کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کامل اتباع نصیب فرمائے اور ہمارے دِل میں نور عطا فرمائے۔

آمین ! یا رب العالمین !

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ نمبر ۱۱

شرائط مفسّر و مترجم

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا موصوف نے یہ مقالہ ۹ رجون سنہ ۶۰ء کو مجلس علوم اسلامیہ کیطرف سے منعقدہ ایک جلسہ میں پڑھا جو حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں "یوم قرآن" کے عنوان سے ہوا اور ۱۰ رجون سنہ ۶۰ء کو جامع مسجد نیلا گنبد میں بطور تقریر بیان فرمایا۔

باہتمام

مکتبہ ملّت دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۝ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝

اعلیٰ سے اعلیٰ اور بالا سے بالا حمد اور شکر ہے اُس خداوند ذوالجلال کے لیے جس نے اپنے عبد خاص اور مقرب ترین و باختصاص بندے اور افضل الرسل پر سب سے اعلےٰ اور اکمل کتاب اُتاری جس میں بال برابر بھی کجی کا نام نشان نہیں۔ نہ لفظی کجی ہے اور نہ معنوی اس لیے کہ قرآن اللہ تعالےٰ کا کلام اور اس کی صفت ہے جو قدیم اور غیر مخلوق ہے اور ذات و صفاتِ خداوندی میں کجی کا امکان نہیں۔ کجی اور کمی مخلوق اور حادث میں ہوتی ہے۔ قدیم میں کجی نہیں ہوتی اور غایت درجہ درست اور راست ہے۔ ہر تعلیم اسکی معتدل اور متوسط ہے۔ جو ہر زمانہ کے مناسب ہے۔ افراط اور تفریط کے شائبہ سے پاک ہے اور تمام مصالح کی متکفل ہے۔ معاش اور معاد کو درست کرنے والی۔

غرض یہ کہ قرآن کریم خداوند ذوالجلال کی طرف سے ایک دستور کامل ہے جس پر عمل کرنے سے خداوند ذوالجلال کی خوشنودی کا پروانہ ملتا ہے اور اعتقاد اور عمل کی اور معاد اور معاش کی کجی اس سے دُور ہو جاتی ہے اور یہ دستورِ خداوندی (قرآن کریم) لوگوں کو احکم الحاکمین کی ہیبت اور اس کے مؤاخذہ اور گرفت سے ڈراتا ہے۔ پس جن لوگوں نے ایمان لاکر اپنی اعتقادی کجی کو اور

اعمال صالحہ کر کے اپنی عملی کجی کو دُور کر لیا ان کو ایسے انعام واکرام کا مژدۂ جانفزار سُناتا ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ دستورِ خداوندی ان لوگوں کو کہ جو احکم الحاکمین اور اُس کے خلفاء اور سفراء اور نائبین یعنی انبیاء و مُرسلین کی بے چون وچرا اطاعت سے گریز کرتے ہیں۔ اس حقیقی حبس دوام اور واقعی دائمی جیلخانہ سے ڈراتا ہے۔ مجازی اور فانی حکومت کا حبس دوام مجازی اور فانی حبس دوام ہے جس کو احکم الحاکمین کے دائمی جیل خانہ سے کوئی بھی نسبت نہیں ہے۔

اس لیے ضروری ہُوا کہ جو لوگ اس دستور آسمانی اور قانون ربانی کو مانتے ہوں اور اس پر عمل کے دعوے دار ہوں تو اوّل اس دستور اور قانون کو صحیح طور پر سمجھیں تاکہ صحیح طور پر اس پر عمل کر سکیں اور اس پر عمل کر کے ان انعامات واکرامات کے مستحق ہوں جن کا رب اعلےٰ نے اُن سے وعدہ فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح طور پر عمل کرنا بغیر صحیح طور پر سمجھے ہُوئے ناممکن اور محال ہے۔ عقل وفہم درست نہ ہو بلکہ اس میں کجی اور زیغ ہو تو وہ قانون خداوندی کو صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے عقلاً ضروری ہُوا کہ دستُور آسمانی اور قانون یزدانی کے ترجمہ اور تفسیر کے لیے کچھ شرائط ہونے چاہئیں جس سے صحیح اور غلط اور حق اور باطل اور کھرے اور کھوٹے کا فرق واضح ہو سکے اور لوگ اصلی اور جعلی مترجم اور مفسر کو الگ الگ پہچان سکیں اور ہر مدعی اور نقال کے جال میں نہ پھنس سکیں اور کج عقل اور کج راہ کے فتنے سے محفوظ ہو جائیں۔

شرائط مترجم ومفسر

قرآن کریم کے مترجم اور مفسر کے لیے کم از کم ان چند اوصاف کا جامع ہونا واجب اور غایت درجہ ضروری ہے۔

اوّل

عربی زبان جس میں قرآن کریم اُترا ہے اس سے اور اس کے قواعد (صرف ونحو وبلاغت ولغت) سے بخوبی واقف ہو اس لیے کہ جو شخص زبان کے قواعد سے پُورا واقف نہ ہوگا وہ اصل سے ترجمہ اور تفسیر کرنے میں قدم قدم پر غلطیاں کرے گا۔ جو شخص صیغہ اور ترکیب اور اسالیب کلام سے پُورا واقف نہ ہوگا وہ کبھی صحیح ترجمہ اور صحیح تفسیر کرہی نہیں سکتا۔ جو شخص انگریزی زبان کی پرائمری بھی نہ جانتا ہو وہ قانون کا ترجمہ اور شرح لکھے تو وہ ایسا نادان ہے کہ وہ اپنے مقام سے بھی بے خبر ہے اور جو ایسے بے خبر کے ترجمہ اور شرح کو معتبر سمجھے وہ اس سے بڑھ کر نادان ہے۔

دوم

قواعد شریعت اور اصول دین اور اصطلاحات شرعیہ سے واقف ہو کیونکہ اصطلاحات کا محض لفظی اور لغوی ترجمہ کر دینے سے متکلم کی مُراد بدل جاتی ہے۔ جو شخص اقلیدس کے اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ سے واقف نہ ہو وہ اقلیدس کی کیا شرح لکھے گا۔ ایسا شخص شکل حماری اور شکل عروسی کا ترجمہ

گدھے والی شکل اور دلہن والی شکل سے کرے گا اور لغت کی کتابوں کا ایک انبار سامنے کر دے گا کہ لغت میں حمار کے معنی گدھے کے ہیں اور عروس کے معنی لغت میں دُلہن کے ہیں۔ یہی حال اس زمانہ کے جدید مترجمین اور جدید مفسّرین کا ہے کہ جو اصطلاحات شرعیہ سے واقف نہیں۔

سوم

علم قرأت سے واقف ہو کیونکہ با اوقات ایک قرأت دُوسری قرأت کے لیے مفسّر ہوتی ہے۔ ایک قرأت مطلق ہوتی ہے۔ دوسری قرأت میں کوئی قید مذکور ہوتی ہے تاکہ مطلق کو مقید پر اور عام کو خاص پر محمول کر سکے۔

چہارم

اسباب نزول سے واقف ہو کہ یہ آیت کس بارے میں اور کس موقعہ پر نازل ہوئی۔ موقعہ اور محل کے معلوم ہونے سے مراد واضح ہوتی ہے۔

پنجم

احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ سے واقف ہو۔ آیت کے نزول کا محل اور موقعہ کا علم بدون احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ ناممکن اور محال ہے اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ آیت کس محل اور کس موقعہ پر اور کس شخص کے حق میں نازل ہوئی ہے تو سوائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے قول کے اور کوئی ذریعہ اس کے معلوم کرنے کا نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس

شخص کو کلام کا موقع اور محل معلوم نہ ہو تو اس کا ترجمہ اور اس کی تفسیر بھی لامحالہ بے موقعہ اور بے محل ہو گی۔

ششم

ناسخ اور منسوخ سے واقف ہو کہ یہ حکم فلاں زمانے میں تھا اور بعد میں منسوخ ہو گیا۔ جس حاکم یا وکیل کو یہ علم نہ ہو کہ حکومت کے فلاں فلاں احکام منسوخ ہو چکے ہیں اور اس کے بعد کے یہ احکام ہیں تو وہ حاکم صحیح فیصلہ اور وہ وکیل صحیح بحث نہیں کر سکتا۔ جب حاکم کو حکومتِ وقت کے سابق اور جدید احکام کا علم نہ ہو وُہ قابلِ معزولی ہے۔

ہفتم

مترجم اور مفسر ذکی اور ذہین ہو کلام کے دقائق باریکیوں اور گہرائیوں کو سمجھتا ہو۔ اس کی عقل اور فہم اور اس کا علم درست ہو اور کجی سے محفوظ ہو جو شخص کج فہم ہو اور قانون کی باریکیوں اور گہرائیوں کو نہ سمجھتا ہو تو وہ عدالت کی کُرسی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اسی طرح جو کتاب وسُنت کے دقائق کو نہ سمجھتا ہو وہ علم کے بوریئے پر نہیں بیٹھ سکتا ؎

مردہ را بور یا قالیں بود   زانکہ خشتش عاقبت بالیں بود

یہ جدید مفسر اپنے زعم میں دین کی خدمت کر رہا ہے مگر در حقیقت اس شعر کا مصداق ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی است   حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی است

۸
ہشتم

علم اساتذہ سے حاصل کیا ہو جس شخص نے باضابطہ اساتذہ سے نہ پڑھا ہو محض شرح اور تراجم کے مطالعہ سے استفادہ کیا ہو اس کا علم معتبر نہیں۔

ڈاکٹری کتابوں کے محض تراجم دیکھ لینے سے ڈاکٹر نہیں بن جاتا اور قانون کا محض ترجمہ پڑھ لینے سے وکیل نہیں بن جاتا۔ جب تک باضابطہ کسی میڈیکل کالج اور لاء کالج میں ماہرین فن سے تعلیم نہ پائی ہو۔

۹
نہم

خود رائے اور متکبر نہ ہو۔ زمانہ کے علماء اور فضلاء کی طرف رجوع کرنے سے عار اور ننگ نہ کرے اور اگر کوئی عالم اس کی لغزش پر مطلع کرے تو اُس کو قبول کرے اور اپنی اصلاح کرے۔ قال تعالیٰ ساصرف عن آیاتی الذین یتکبرون فی الارض۔

۱۰
دہم

علماء معاصرین اور فضلاء زمانہ کی نظر میں اس کا علم و فہم اور تقویٰ مسلّم اور معتبر ہو۔ علم و فضل وہ ہے جس کا دوسرے فضلاء اعتراف کریں۔ فضل و کمال کے لیے محض دعویٰ کافی نہیں۔

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

(طریقہ امتحان) جس کو اپنے علم و فضل کا دعویٰ ہو اس کے امتحان کا

طریقہ یہ ہے کہ اُن کو سادہ قرآن کا نسخہ دے دیا جائے اور اُن سے قرآن کریم کے تین رکوع یا تین آیات کے متعلق سوالات کیے جائیں کہ ان آیات کے صیغے اور اعراب اور بلاغت بیان کرو اور کتب تفاسیر سے اس کا موازنہ کیا جائے یا بالمشافہ کسی عالم اور مفسر کے سامنے اُن سے سوال کریں تو پھر اس مدعی کے اس دعوے کی حقیقت روشن ہو جائے گی کہ تمام مفسّرین نے غلط سمجھا اور قرآن کریم کا صحیح مطلب وہ ہے کہ جو مَیں بیان کر رہا ہوں۔

دلیل کلی اور اجمالی

ان تمام امور مذکورہ کی دلیل کلی اور اجمالی یہ ہے کہ جو مترجم اور مفسر ان شرائط کا جامع نہ ہو گا۔ وہ قرآن کریم کی تفسیر اپنی رائے اور خواہش کے مطابق کرے گا جس کا غلط اور گمراہی ہونا آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ثابت ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ (سورہ قصص)

ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر ثانی عطفہ لیضل عن سبیل اللہ لہ فی الدنیا خزی ونذیقہ یوم القیامۃ عذاب الحریق۔ (سورۃ الحج)

جو شخص قانون حکومت کو اپنی خواہشوں پر ڈھالنا چاہے اور اس کے

واقعات کی ایسی عجیب و غریب تشریحات کرے کہ جو عدالت عالیہ کے کسی فاضل جج کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی ہوں تو ایسا شخص حکومت کے آہنی پنجہ سے چھوٹ نہیں سکتا۔ اسی طرح جو شخص قانونِ خداوندی کے ایسے عجیب و غریب معانی بیان کرے کہ جو عہد صحابہ سے لے کر اس وقت تک کسی عالم ربانی اور فاضل لاثانی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئے ہوں تو سمجھ لو کہ یہ شخص ملحد اور زندیق ہے: یحرفون الکلم عن مواضعہ اور یریدون ان یبدلوا کلام اللہ کا مصداق ہے۔

حدیث میں ہے:۔

من قال فی القران برأیه فاصاب فقد اخطاء۔ (ترمذی و ابو داؤد)	وہ جو شخص قرآن کے معنی اپنی رائے سے بیان کرے اگرچہ وہ معنی صحیح ہوں مگر یہ شخص خاطی اور مجرم ہے"۔

جو شخص بغیر ڈاکٹری پڑھے ہوئے کسی کا علاج کرے اگرچہ اس کے علاج سے مریض شفایاب ہو جائے تو ایسا معالج حکومت کی نظر میں مجرم ہے۔ بغیر پڑھے اور بغیر سند کے تمہارے لیے علاج کرنا ممنوع تھا۔ تم نے یہ جرأت کیسے کی اور جس شخص نے باضابطہ ڈاکٹری پڑھی ہو، اس کے زیر علاج اگر کوئی مریض اس کی غلطی اور لغزش سے مر بھی جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

تفسیر بالرای

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرای کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کا کسی

شئے کی طرف کوئی طبعی میلان اور رغبت ہو۔ پس وہ قرآن کی تفسیر اس طرح کرے کہ وہ معنی اس کی رائے اور ہوائے نفس پر منطبق ہو جائیں تاکہ اپنی غرض اور رائے کی تصحیح کے لیے آیت قرآنی کو حجت میں پیش کر سکے۔ ورنہ اگر اُس کے دل میں یہ رائے اور یہ خواہش اور میلان نہ ہوتا تو یہ معنی اُس کو قرآن سے منکشف نہ ہوتے۔ تفسیر قرطبی ص ۳۳۔ ج ۱۔

پس جو شخص کسی آیت قرآنی کا مطلب اپنی رائے اور اپنے خیال سے ایسا بیان کرے کہ جو قواعد عربیت (یعنی عربی زبان کے قواعد) یا شریعت کے قواعد اور اصول اور مسلمات دین کے خلاف ہو تو اس کو تفسیر بالرای کہتے ہیں اور تفسیر بالرای دراصل تحریف معنوی ہے۔ جیسے قانون حکومت کا ایسا مطلب بیان کرنا کہ جو انگریزی زبان کے قواعد کے خلاف ہو یا دستورِ حکومت کے اصول مسلمہ کے خلاف ہو وہ قانون حکومت کی شرح نہیں بلکہ اس کی تحریف ہے۔ اسی طرح تفسیر بالرای کو سمجھو کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر نہیں بلکہ اس کی تحریف ہے۔ مثلاً جن کی طبیعت پر سیاست کا غلبہ ہوتا ہے وہ قرآن کریم کی تمام عبارتوں کو سیاست پر محمول کرتے ہیں کہ نماز روزہ سب سیاست کے لیے ہے۔ نماز میں پریڈ کی تعلیم ہے تاکہ افسر کی اطاعت کرنا آجائے۔ اگر وہ اُٹھنے کو کہے تو اُٹھو اور بیٹھنے کو کہے تو بیٹھو جھکنے کو کہے تو جھک جاؤ۔ امام اس لیے مقرر کیا جائے تاکہ اسی پریڈ کے وقت افسر کی اطاعت کریں۔ روزہ اس واسطے مشروع ہوا تاکہ جنگ میں فاقہ کا تحمل ہو سکے اور حج اس لیے مشروع ہوا کہ دور دراز اور سردی اور گرمی میں ایک چادر اور ایک لنگی سے سفر کرنے کے عادی ہو جائیں۔ گویا کہ ساری عبادتیں حق تعالےٰ کی یاد اور بندگی اور

حق عبودیت کے بجالانے کے لیے مشروع نہیں ہوئیں بلکہ ساری شریعت میں ملک گیری اور سیاست کی تعلیم ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جماعت اور حج سے مقصود قوم کا اتفاق ہے۔ اور یہ مقصد کلب اور سینما میں جمع ہونے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ کسی کے مزاج پر فلسفہ اور سائنس کا غلبہ ہے وہ آیات قرآنیہ کی تفسیر یورپ کی تحقیقات اور سائنس کے مسائل سے اس طرح سے کرتا ہے کہ گویا قرآن حکیم کسی ماہر سائنس اور ماہر طبعیات اور موسمیات پر اترا ہے۔ ؎

بر ہوا تاویل قرآن می کنی — پست وکژ شد از تو معنی سُنی

چوں ندارد جان تو قیدیلہا — بہر بینش می کنی تاویلہا

مثلاً کبھی کواکب اور سیارات اور بروج کے مسائل آیات قرآنیہ سے ثابت کرتے ہیں اور کبھی قرآن سے تخم درخت میں نرو مادہ ثابت کرتے ہیں۔ کما قال تعالےٰ :

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ ۔

اے میرے عزیزو! خوب سمجھ لو کہ یہ قرآن کریم کی تفسیر نہیں بلکہ تحریف معنوی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کریم کا موضوع ہی معلوم نہیں کہ قرآن کریم کس غرض کے لیے اُتارا گیا۔ قرآن کریم نہ تو فلسفہ اور سائنس کی کوئی کتاب ہے اور نہ کوئی تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب ہے۔ قرآن کریم تو طب روحانی کی ایک آخری اور بے مثال کتاب ہے جس میں روحانی امراض کے معالجات کو بیان کیا گیا ہے۔ پس جس طرح طب جسمانی اور ڈاکٹری کی کتاب میں

کفش دوزی اور پارچہ سازی اور گھڑی سازی وغیرہ وغیرہ کی تحقیق و تلاش کرنا مراق اور خبط ہے۔ اسی طرح طب روحانی کی اس بے مثال کتاب (قرآن کریم) میں معدنیات اور نباتات اور فلکیات کے مسائل کی تلاش بھی بلاشبہ مراق اور خبط ہو گا۔

اس قسم کی تفسیریں مرعوبانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہیں کہ یورپ کی مادی ترقیات سے مرعوب ہو کر آیاتِ قرآنیہ کو سائنس کے مسائل اور جدید تحقیقات پر ڈھال دیا جن پر خود ماہرین سائنس کو پورا وثوق اور اطمینان نہیں کہ شاید آئندہ چل کر ہماری یہ تحقیقات غلط ثابت ہو جائیں۔ عجب ماجرا ہے کہ استاذ تو شک اور تردد میں ہے اور شاگرد یقین کی آخری منزل میں ہے۔ گویا کہ یہ جدید مفسرین فلاسفہ یورپ کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ آپ ہم سے ناراض نہ ہوں ہمارا قرآن آپ کی تحقیقات کے خلاف کچھ نہیں کہتا بلکہ ہمارا قرآن آپ کی جدید تحقیقات کی تائید میں نازل ہوا ہے ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

اے میرے عزیزو! اگر آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر سائنس کے مسائل اور جدید تحقیقات سے کی جائے تو اس میں بہت خرابیاں لازم آئیں گی۔

(۱)

ایک خرابی تو یہ لازم آئے گی کہ ان آیات کے اوّلین مخاطب اہل عرب تھے اور وہ بلکہ سارا عالم اور قیصر و کسریٰ کی متمدن حکومتیں بھی ان چیزوں سے بالکل بے خبر تھیں بلکہ روئے زمین پر ایک آدمی بھی ان سے آشنا نہ تھا تو ان کے سامنے فلسفہ اور سائنس کے مسائل بیان کرنے سے کیا فائدہ

(۲)

بلکہ جس ذات بابرکات پر یہ قرآن نازل ہوا اس کے بھی وہم و گمان میں یہ معانی نہ تھے۔ کیا معاذ اللہ جس ذات بابرکات پر قرآن نازل ہوا اس نے ان معانی جدیدہ کو نہیں سمجھا اور عہدِ صحابہ سے لے کر اب تک ہزارہا علماء ربانیین گزرے اور صدہا غزالی اور رازی گزر گئے لیکن آج تک کسی نے بھی یہ معانی نہیں سمجھے جو آج کل کے یہ جدید مفسّر بیان کر رہے ہیں۔ کیا یہ جدید مفسّر غزالی اور رازی سے علم، فہم اور تقوے میں کچھ آگے ہیں؟

؏ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

؎ مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

(۳)

تیسری خرابی یہ لازم آئے گی کہ سائنس کی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں۔ پس اگر ان تحقیقات کو مدلولِ قرآنی قرار دیا جائے تو احتمال ہو گا کہ شاید آئندہ زمانے میں یہ تحقیقات غلط ثابت ہوں تو اس صورت میں کلامِ خداوندی کا غلط ہونا لازم آئے گا۔

(۴)

چوتھی خرابی یہ لازم آئے گی کہ اگر محققینِ یورپ ان جدید مفسّرین سے یہ سوال کریں کہ قرآن کریم کو نازل ہوئے تقریباً چودہ سو برس ہو گئے تم یہ بتلاؤ کہ ہماری ان تحقیقات کے ظہور سے پہلے تم قرآن کریم کی ان آیات کا کیا مطلب سمجھتے تھے اور تمہارے اسلاف غزالی و رازی ان تحقیقات سے پہلے گزر گئے

وہ ان آیات کا کیا مطلب سمجھتے تھے ؟ اور اگر ان آیات سے ہمارے فلسفہ اور سائنس کی بھی جدید تحقیقات مراد ہیں تو آپ کو ہمارا ممنون احسان ہونا چاہیئے کہ جن آیات کا مطلب آج تک آپ کو نہ نبی کے ذریعہ اور نہ صحابہ و تابعین اور علماء ربانیین کے ذریعہ حل ہوا تھا وہ آج آپ کو ہماری ان جدید تحقیقات سے حل ہو گیا ۔ یہ قرآن نازل تو ہوا تمہارے نبی پر مگر اس کا مطلب حل ہوا ہماری ان جدید تحقیقات سے ۔ یہ جدید مفسرین بتلائیں کہ یورپ کے فلاسفہ کے اس سوال کا کیا جواب دیں گے ۔

(۵)

پانچویں خرابی یہ لازم آئے گی کہ اگر فلاسفہ یورپ یہ سوال کریں کہ اگر قرآن کے نازل کرنے سے انہیں جدید تحقیقات اور سائنس کے مسائل کو بیان کرنا مقصود تھا تو پھر ہمیں قرآن کی اور تمہارے نبی کی اور تمہارے دین کی کوئی ضرورت نہیں ۔ ہم بغیر قرآن کے ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جو تمہارے سامنے ہے اور تم باوجود قرآن کے اس ترقی کے میدان سے دور ہو اور اگر تم نے ترقی کے میدان میں کچھ قدم رکھا ہے تو وہ بھی ہماری اعانت اور امداد سے ۔ اے مسلمانو ! تم ہمیں کس قرآن اور کس اسلام کی دعوت دیتے ہو ۔ اگر ہمیں قرآن اور اسلام کی دعوت انہی مسائل کے لیے دیتے ہو تو ہمیں نہ تمہارے قرآن کی ضرورت ہے اور نہ اسلام کی کوئی حاجت ہے ۔ ہم بغیر قرآن ہی کے ان تحقیقات پر پہنچ چکے ہیں تو یہ جدید مفسرین بتلائیں کہ فلاسفہ یورپ کے اس سوال کا کیا جواب دیں گے ۔

پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم طب روحانی کی ایک بے مثال کتاب ہے

اور اس کی صحیح تفسیر اور صحیح مفہوم وہی ہے کہ جو عہد صحابہ سے لے کر مشرق و مغرب
کے علماء ربانیین بیان کرتے آئے۔ قانون حکومت کا وہی مفہوم اور مطلب معتبر
ہے کہ جو عدالت عالیہ کے ججوں نے سمجھ کر فیصلے دیئے ہیں۔ جج کے فیصلہ کی مخالفت
قانون حکومت کی مخالفت تصوّر کی جاتی ہے اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں
قانون حکومت کا مخالف نہیں میں تو فقط اس جج کا مخالف ہوں اور یہ کہتا
ہوں کہ اس نے قانون حکومت کا مطلب غلط سمجھا اور یہ جج معصوم
بھی نہیں۔ تو کیا کسی کی یہ تقریر دلپذیر عدالت میں قابل سماعت ہو گی۔ بیشک
فاضل جج معصوم نہیں لیکن ماہر قانون ہے اور صدہا فاضل ججوں کی عقلیں اس کی
پشت پر ہیں اور تم نے قانون باضابطہ پڑھا نہیں۔ محض ترجمہ دیکھ کر اپنی ہوشیاری
سے قانون کو اپنی خواہش پر ڈھالنا چاہتے ہو۔

خوب سمجھ لو کہ تمہاری یہ لولی لنگڑی عقل، قانون حکومت پر حاکم نہیں۔
بلکہ قانون حکومت تمہاری عقل اور فہم پہ حاکم ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ
کہے کہ میں قانونِ خداوندی کا منکر نہیں۔ لیکن یہ کہتا ہوں کہ قاضیوں نے اور
محققیوں نے اس قانون کا مطلب غلط سمجھا ہے اور صحیح مطلب وہ ہے کہ جو
میں بیان کر رہا ہوں اور میں خدا اور رسُول کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ علماء کی
مخالفت کرتا ہوں اور علماء معصوم نہیں۔ درست ہے کہ علماء معصوم نہیں مگر وہ
عالم ہیں اور ان کا علم اور فہم اور نور تقوٰے اُمت میں مسلم ہے اور عالم اور
ماہر فن کی غلطی پکڑنا کسی عامی کا کام نہیں، معصوم نہ تو عالم ہے اور نہ جاہل اس سے
یہ کہاں لازم آیا کہ فقط غیر معصوم ہونے کی وجہ سے جاہل، عالم کے برابر ہو جائے
اور عامی پر عالم کا اتباع لازم نہ رہے۔ ھل یستوی الذین یعلمون والذین

لایعلمون فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمو ن ۔ جس طرح کوئی مریض کسی طبیب کے علاج پر یہ کہہ کر نکتہ چینی نہیں کر سکتا کہ طبیب معصوم نہیں اسی طرح کسی عامی کو عالم پر نکتہ چینی کا حق نہیں ۔

پیش یوسف نازت و خوبی مکن | جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش | باھزاران گریہ و آشوب باش
نازرا روئے بباید ہمچو ورد | در نداری گرد ید خولی مگرد

ؐ

ایں سخن را نیست ہرگز اختتام | ختم کن واللہ اعلم بالسلام

والخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلٰوۃ والسلام
علےٰ سیّدنا و مولانا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین
وعلینا معھم یا ارحم الرّٰحمین ۔ ؛ آمین

لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ

العجالۃ فی تحقیق معنی النبوۃ والرسالۃ،

یعنی

نبوّت و رسالت

از

حضرت الحاج مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس اللہ سرّہٗ

یہ مقالہ جلسہ عید میلاد النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں مولانا نے خود پڑھکر سُنایا جو "قائد اعظم سوسائٹی" کے زیر اہتمام اور عالیجناب جسٹس ایس اے رحمان جج سپریم کورٹ پاکستان کی زیر صدارت ۲۰ ستمبر ۱۹۵۹ء کو وائی ایم سی اے ہال میں منعقد ہوا۔

باہتمام

مکتبہ ملت دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا
ان ھدانا اللہ لقد جآءت رسل ربنا بالحق ۰

”حمد ہے اُس خداوند ذوالجلال کی جس نے ہم کو دینِ حق کی ہدایت دی اور ہم ہرگز ہدایت
نہ پاتے اگر اللہ تعالےٰ ہم کو ہدایت نہ دیتا بے شک ہمارے رب کے پیغمبر حق لے کر آئے ہیں۔“

انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مبعوث ہونا اہلِ جہان کے لیے حق تعالےٰ
شانہٗ کی رحمت کبریٰ اور منتِ عظمیٰ ہے اگر ان بزرگواروں کا واسطہ اور ذریعہ نہ ہوتا
تو ہم بے سمجھوں کو اس واجب الوجود جل مجدہٗ کے وجود اور اس کی وحدت کی طرف
کون ہدایت کرتا اور ہمارے مولیٰ جل شانہٗ کے احسانات اور انعامات بے غایات و
بے نہایات کے شکر کے طریقے کون بتاتا اور اس کے اوامر اور نواہی اور مرضیات
اور نامرضیات میں کون تمیز کرتا اور ہمارے مبدا اور معاد سے اور دُنیا اور آخرت
کے احکام سے ہم کو کون آگاہ کرتا۔ یوُنان کے حکماء اور فلاسفہ نے باوجود
کمال فہم و فراست و کمال دانائی صانع عالم کے وجود کی طرف ہدایت نہ پائی اور
کائنات کے وجوُد کو دھر یعنی زمانہ کی طرف منسوب کیا اور کہا:

وما یھلکنا الا الدھر ”اور ہم کو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔“

لیکن حضرت انبیاءِ کرام کے دلائل اور براہین جب آفتاب کی طرح جلوہ گر
ہوئے تو متاخرین فلاسفہ طوعاً و کرھاً وجود صانع جل شانہ کے قائل ہوئے اور
اپنے متقدمین کے مذہب کو رد کیا۔

ہماری ناقص عقلیں دُنیا اور آخرت کے بارے میں بغیر انبیاءِ کرام کی رہنمائی

کے معزول اور بے کار بلکہ مخذول اور خوار ہیں۔

عالم میں جدھر بھی نظر ڈالیے ایک عظیم اختلاف نظر آتا ہے۔ ایک ہی فعل اور ایک ہی نظریہ ہے کہ ایک ہی شخص اُس کو مستحسن بتلا رہا ہے۔ اور دوسرا اس کو غایت درجہ قبیح سمجھتا ہے۔ دونوں طرف عقلاء کی جماعت ہے اور یہ اختلاف اس درجہ شدید ہے کہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔

عقلاء کا اشیاء کے حسن و قبح میں اختلاف یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خیر و شر اور حسن و قبح کی تقسیم پر تو اتفاق ہے۔ اختلاف فقط تعین میں ہے کہ کون سی شئے اچھی ہے اور کون سی بُری۔ اس تقسیم میں کسی کو اختلاف نہیں کہ بعض چیزیں اچھی ہیں اور بعض بُری۔ اور اس پر بھی تمام عقلاء کا اتفاق ہے کہ عقول میں بڑا تفاوت ہے۔ کسی کی عقل شمع اور چراغ کی طرح ہے اور کسی کی ستاروں کی طرح اور کسی کی چاند اور سورج کی طرح ہے پھر یہ کہ بعض رنگ ایسے ہیں کہ دن ہی میں اُن کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ رات میں اُن کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ کشمشی اور عنابی اور مکوہی رات کو ایک ہی رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ دن میں فرق معلوم ہوتا ہے اور دن میں بھی فرق اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کوئی گرد و غبار نہ ہو۔ ایسا ہی ہر عقل سے اعمال کے صحیح حسن و قبح کا ٹھیک ٹھیک فرق نہیں معلوم ہو سکتا جب تک کہ وہم اور غرض اور نفسانی خواہش کا گرد و غبار بالکلیہ سامنے سے نہ ہٹ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ محبت میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ ؎

محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

اور یہی وجہ ہے کہ آدمی کو اپنی اور اپنی پارٹی کے عیب نظر نہیں آتے اور دوسروں کی بھلائی بھی برائی دکھائی دیتی ہے ۔

معلوم ہُوا کہ اشیاء کے حسن و قبح اور حسن قبح کے فرق مراتب معلوم کرنے کے لیے ایسی کامل عقل چاہیئے کہ جو آفتاب کا حکم رکھتی ہو اور ہزاراں ہزاراں میل تک کسی ادنےٰ وہم اور کسی نفسانی خواہش کا ذرہ برابر نام و نشان بھی نہ ہو ۔ ایسی کامل عقل حضرات انبیاء کی ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں انبیاء کرام کو عباد مخلصین اور مصطفین الاخیار کے الفاظ سے ذکر فرمایا ہے مطلب اُن کا یہ ہے کہ حق تعالےٰ جن کو اپنا سفیر یعنی نبی اور رسول بنا کر بندوں کی طرف بھیجتے ہیں وہ من کل الوجوہ پسندیدہ اور برگزیدہ اور خدا کے مُخلص ایسی بندے ہوتے ہیں اور مخلص کے معنی خالص کے ہیں جس میں کسی دوسری چیز کا شائبہ نہ ہو ۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کو عباد مخلصین اس معنی میں کہا گیا ہے کہ اُن کا ظاہر و باطن خالص اللہ تعالےٰ کے لیے ہوتا ہے ۔ نفس اور شیطان کے شائبہ سے بالکل پاک ہوتا ہے ۔ عقل اگرچہ ایک درجہ میں حجت ہے مگر ناتمام ہے ۔ مرتبۂ بلوغ کو نہیں پہنچی ہے حجت بالغہ انبیاء کرام کی بعثت ہے ؎

خلق اطفالند جز مست خدا   نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

اے میرے دوستو ! خوب سمجھ لو کہ عقل عالم ہے حاکم نہیں ۔ حق تعالےٰ نے عقل اس لیے دی ہے کہ احکم الحاکمین کے جو احکام تم کو اس کے وزراء یعنی انبیاء و رسل کے ذریعہ سے پہنچیں ان کو سمجھو اور ان کا اتباع کرو ۔ تم کو عقل اس لیے نہیں دی گئی کہ تم احکام خداوندی اور اس کے وزراء اور خلفاء پر تبصرہ کرو ۔

حق جل شانہٗ جس طرح ہمارے وجود کے مالک ہیں اسی طرح ہماری عقلوں کے بھی مالک ہیں وہ اگر چاہیں تو ایک سرسام طاری کر کے عقل کو سلب کر لیں یا یکایک بلا کسی سبب کے کسی کو دیوانہ بنا دیں۔ پس جبکہ عقل خداوند ذوالجلال کی مملوک اور اس کا عطیہ ہے اور اس درجہ لاچار اور درماندہ ہے تو اس کو احکم الحاکمین کے احکام پر نکتہ چینی کرنے سے کچھ تو شرمانا چاہیئے۔

مارشل لاء کی عدالت سے جب یہ حکم جاری ہوا کہ مارشل لاء کے احکام پر کسی کو تبصرہ اور رائے زنی کی اجازت نہ ہوگی تو اس ناچیز کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ؎

مارشل لاء چہ بود ای ارجمند — چشم بند و گوش بند و لب بہ بند

حکم فانی را چو شد ایں حرمتے — حکم باقی را بدان چوں رفعتے

حق تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہماری دُنیا اور آخرت کے احکام کو ہماری عقلوں پر نہیں چھوڑا۔ ورنہ ہر بوالہوس اپنی عقل کی برتری کا مدعی ہوتا۔ بلکہ ہماری دُنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح کے احکام دے کر انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا تاکہ تمام بندے ایک ہی مرکز پر متفق اور جمع ہو جائیں۔ اس لحاظ سے نبی کی بعثت حق تعالےٰ کی عجیب رحمت ہے۔ اگر انبیاء کرام مبعوث نہ ہوتے تو خیر و شر اور نیک و بد میں کوئی تمیز نہ رہتی اور عدل اور ظلم کی حقیقت ملتبس ہو جاتی۔ ظالم ظلم کو عدل بتلاتا اور عدل کو ظلم۔ اس ذات بابرکات نے جو دستور اور جو قانون بندوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کرام کے توسط سے نازل فرمایا سب کو مل کر اس کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اس سے اختلاف اور افتراق نہ کرنا چاہیئے۔

قال اللہ تعالےٰ:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

اس آیت میں حق جل شانہ نے اتفاق کا حکم دیا اور تفرق اور اختلاف سے منع فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جو قانون اُتارا ہے سب مل کر اس پر عمل کرو۔ اس کے خلاف مت چلو۔

تمام عقلار اور وزرار یہ خوب جانتے ہیں کہ تمام عالم کا کسی شئے پر متفق ہونا ناممکن اور محال ہے لیکن باوجود اس علم کے پھر یہ تلقین کرتے ہیں کہ سب متفق ہو کر رہو۔ معلوم ہوا کہ مطلب یہ ہے کہ قانون حکومت کا مل کر اتباع کرو۔ اور قانون کا خلاف نہ کرو۔ مطلق اتفاق مقصود نہیں بلکہ قانون حکومت کے ساتھ متفق ہونا مقصود ہے۔ مطلق نا اتفاقی کسی قانون میں جرم نہیں۔ حق سے نا اتفاقی یہ جرم ہے۔ بلکہ حق کے مقابلہ میں اتفاق جرم ہے۔ حکومت کے نزدیک تفرقہ کا مجرم وہ شخص ہے کہ جو قانونِ حکومت کے خلاف کرے یا قانونِ حکومت کے عجیب و غریب معنی بیان کرے کہ جو اَب تک کسی وزیر یا کسی حاکم یا کسی جج کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ گزرے ہوں۔

اسی طرح جو شخص کتاب وسنت اور شریعت کے کسی حکم کے خلاف کرے یا کسی حکم شرعی میں ایسی تاویل کرے کہ جو آج تک چودہ صدی کے علمارِ ربانیین اور قضاۃ اور حکام کے وہم و خیال میں بھی نہ گزرے ہوں تو ایسے شخص کو اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق کہتے ہیں۔

حضرات انبیار دُنیا میں تشریف لائے اور توحید کی دعوت دی کوئی ایمان لایا اور کوئی بُت پرستی اور آتش پرستی اور صلیب پرستی پر قائم رہا اور اس طرح ہر گھر میں اختلاف قائم ہو گیا۔

معاذ اللہ! کیا یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرات انبیار تفرقہ کا سبب بنے۔

تفرقہ کے مجرم وہ ہیں جنہوں نے توحید کے مقابلہ میں بُت پرستی اور صلیب پرستی کو اختیار کیا اور آبِ زمزم کے مقابلے میں گائے کے پیشاب کو متبرک سمجھا۔

نبی اور رسول کی تعریف

ہمارے اس بیان سے نبی اور رسول کی تعریف بھی واضح ہوگئی وہ یہ کہ نبی اور رسول خداوند ذوالجلال کے اس برگزیدہ اور پسندیدہ بندے کو کہتے ہیں کہ جو ہر اعتبار سے یعنی عقل اور علم اور اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے من کل الوجوہ پسندیدہ اور برگزیدہ ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف سفیر مقرر کر کے بھیجا ہو تاکہ بندوں کو معاش اور معاد۔ دین اور دُنیا کے ان احکام اور مصلحتوں اور ہدایتوں سے آگاہ کر دے کہ جہاں عقل اور تجربہ کی رسائی نہیں۔ تاکہ بندے ان احکام پر عمل کر کے اپنی دُنیا اور آخرت کو دُرست کریں۔ اور خدائے ذوالجلال کی رضاء اور خوشنودی کو حاصل کریں اور اس کے قہر سے بچ جائیں۔

جو چیزیں عقل سے معلوم ہوسکیں جیسے حساب اور اقلیدس یا جو چیزیں تجربے سے معلوم ہوسکیں جیسے صنعت وحرفت۔ حضرات انبیاء ان چیزوں کے بتلانے کے لیے مبعوث نہیں ہوتے۔ ان کا کام احکام خداوندی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ یہ چیز حق تعالیٰ کے قانون میں جائز یا ناجائز ہے جیسے حکومت کا دستور اور قانون جمع اور تفریق اور صنعت وحرفت سے بحث نہیں کرتا بلکہ جمع وتفریق اور صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت کے احکام بتاتا ہوتا ہے۔ اسی طرح قانون غرلیہ کو سمجھو۔ وزراء کا کام احکام صادر کرنا ہے اور یہ بتلانا کہ جوتا کیسے بنتا ہے اور

کپڑا کیسے بُنا جاتا ہے یہ اُن کا کام نہیں بلکہ اس کی شان کے لائق بھی نہیں۔

انتم اعلم باموردینا کم "تم اپنی دُنیا کے معاملات کو زیادہ جانتے ہو۔"

کا مطلب بھی یہی ہے زراعت اور تجارت کے طریقوں کو تم زیادہ جانتے ہو میرا کام تو احکام خداوندی بتلا دینا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت درخت میں سے انی انا اللہ یعنی بے شک میں ہی خدا ہوں کی آواز سُنی تو وہ آواز درخت کی نہ تھی وہ درخت تو محض ایک فون تھا جس کے پس پردہ خداوند ذوالجلال کلام فرما رہا تھا۔ اسی طرح نبی کی زبان اور حلق کو خدا تعالےٰ کا ٹیلیفون سمجھو کہ جو آواز نبی کے مُنہ سے نکل رہی ہے وہ اللہ تعالےٰ کی آواز ہے۔

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی۔ "اور وہ (نبی صلے اللہ علیہ وسلم) ہوائے نفسانیہ سے نہیں بولتے بلکہ وہ تو وحی ہے جو (خدا کی طرف سے) نازل کی جاتی ہے۔"

؎ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

وقال تعالےٰ۔ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔ "یعنی وہ کنکریاں آپ نے نہیں پھینکیں۔ بلکہ اللہ ہی نے پھینکیں۔"

وقال تعالےٰ۔ ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم۔ "یعنی بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہے۔"

اور جو لوگ اُس کے رسولوں کے درمیان تفرقہ کرتے ہیں ان کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے:۔

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ	"بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے
ویریدون ان یفرقوا بین اللہ	رسولوں کے ساتھ اور اللہ اور اُسکے رسولوں میں
ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض	فرق کرنا چاہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ہم
ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا	بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض سے کفر کرینگے
بین ذلک سبیلا اولٓئک	اور وہ اسکے بین بین راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں
هم الکافرون حقا واعتدنا	یہی لوگ ہیں پکے کافر اور ہم نے کافروں کیلئے
للکافرین عذاباً مهینا - النساء	ذلت دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

شریعت محمدیہ اللہ تعالےٰ کا آخری قانون ہے۔ حق جل شانہٗ نے ہر نبی کو ایک شریعت اور قانون عطا کیا۔

لکل جعلنا منکم شرعة	"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک
ومنهاجا -	شریعت اور راہ بنائی"

اسی طرح نبی آخر الزمان سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کو ایسی کامل اور مکمل شریعت عطا فرمائی کہ جو تمام شریعتوں سے اکمل اور اجمع ہے اور تمام گذشتہ قوانین کی ناسخ ہے۔ کما قال تعالےٰ

ثم جعلناک علی شریعة	"یعنی پھر ہم نے آپ کو ایک ایسی شریعت پر
من الامر فاتبعها ولا تتبع	قائم کر دیا جو خدا کی طرف سے ہے۔ پس اس
اهواء الذین لا یعلمون -	کا اتباع کیجئے اور جاہلوں کی خواہشات
	کا اتباع نہ کیجئے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت مطہرہ کی مخالفت عقل نہیں بلکہ ہوائے نفسانی ہے کیونکہ اس آیت میں شریعت کے اتباع کا حکم فرما کر یہ نہیں فرمایا کہ عقل کا

اتباع نہ کرنا بلکہ یہ فرمایا گیا کہ ہوائے جہلاء کا اتباع نہ کرنا۔ معلوم ہوا کہ جاہلانہ خواہشات نفسانیہ ہی شریعت سے متصادم ہوتی ہیں۔ ورنہ عقل ہر حکم شریعت کو قبول کر لیتی ہے اور صحیفہ یسعیاہ علیہ السلام باب ۲۸ آیت ۱۳ میں ہے۔

سو خداوند کا کلام ان سے یہ ہوگا حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔ اھ

چنانچہ قرآن عزیز اسی طرح تھوڑا تھوڑا نازل ہوا اور انجیل۔ علماء نصاریٰ کے نزدیک منزل من اللہ ہی نہیں۔ بلکہ وہ حواریین کی تصنیف ہے۔ قال تعالےٰ:

وقرآنا فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث ونزلناہ تنزیلا

"قرآن کو ہم نے متفرق کر کے نازل کیا تاکہ آپ اسکو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا نازل کیا"

وقال تعالےٰ۔ وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذلک لنثبت بہ فوادک ورتلناہ ترتیلا۔

"اور کافروں نے اعتراض کیا کہ یہ قرآن آپ پر ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کر دیا گیا۔ (سو) یہ اسی طرح نازل کیا گیا تاکہ ہم اسکے ذریعے سے آپ کے قلب کو مضبوط رکھیں اور ہم نے اسکو آہستہ آہستہ نازل کیا"

اور انجیل یوحنا باب چہارم آیت ۱۶ میں ہے:

"میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے تاکہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے"

اور آیت ۲۹ میں ہے:

"اور اب میں نے تمہیں اس کے واقع ہونے سے پیشتر ہی کہا تھا

کہ جب وہ وقوع میں آئے تو تم ایمان لاؤ ۔

اور آیت ۳۰ میں ہے :

"بعد اس کے میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا اس لیے کہ اس جہان کا سردار آتا ہے "۔

جہان کے سردار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام پیغمبروں کا سردار ہو گا اور ابد تک تمہارے ساتھ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کتاب اور اس کی شریعت قیامت تک باقی اور محفوظ رہے گی ۔ اس میں ایک حرف کا بھی تغیر اور تبدل نہ ہو سکے گا ۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۔

مصطفےٰ را وعدہ کرد الطاف حق ۔۔۔ گر بمیری تو نمیرد ایں سبق

من کتاب و معجزت را حافظم ۔۔۔ بیش وکم کس از قرآں را رافضم

کس نتاند بیش وکم کردن درو ۔۔۔ تو بہ از من حافظے دیگر مجو

تاقیامت باقیش داریم ما ۔۔۔ تو مترس از نسخ دین اے مصطفیٰ

اے رسول ما تو جادو نیستی ۔۔۔ صادقی ہم خرقہ موسیستی

ہست قرآں مر ترا ہمچو عصاء ۔۔۔ کفرہا را درکشد چوں اژدھا

نصیحت اور دعاء

اب میں اول اپنے نفس کو اور داعیان جلسہ اور حاضرینِ مجلس کو نصیحت کرتا ہوں کہ فقط اس پر اکتفا نہ کریں کہ سال بھر میں ایک مرتبہ

سیرت مبارکہ کے نام سے جلسہ کر لیا کریں بلکہ دل و جان سے اس نبی امی فداہ نفسی وابی وامی کا یہ سمجھ کر اتباع کریں کہ آپ کا اتباع خداوند ذوالجلال کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔

اے اللہ! ہم کو اور ہماری اولاد کو ہمارے احباب کو اور تمام مسلمانوں کو اور ہمارے حکام اور وزراء کے ظاہر اور باطن اور صورت و سیرت کو دین اسلام کے رنگ میں رنگ دے اور ہماری اس اسلامی حکومت کو محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی حکومت کا نمونہ بنا اور قائد اعظم اور قائد ملت اور ان کے اعوان و انصار کے درجے بلند فرما۔ جنہوں نے اس اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں کو قومیت اور وطنیت کے فتنہ سے نکال کر اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع کیا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ وصلی اللہ تعالےٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین۔ وعلینا معھم یا ارحم الراحمین۔